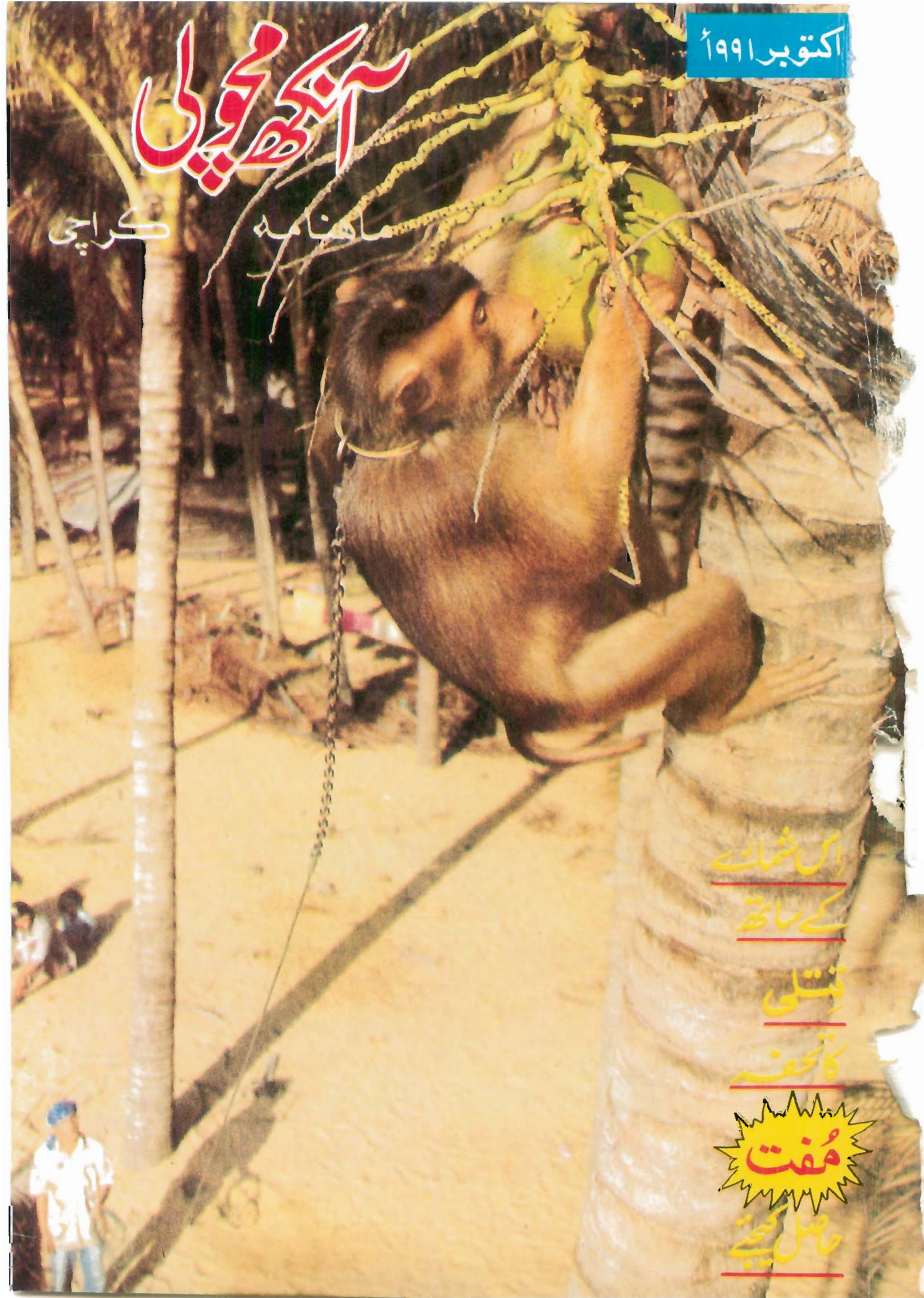

اکتوبر ۱۹۹۱ء
آنکھ مچولی
ماہنامہ
کراچی
اس شمارے
کے ساتھ
تتلی
کا تحفہ
مُفت
حاصل کیجیے

Montgomery
tea time
tea time
Montgomery
Montgomery
Montgomery
The Height of Delight!
Orient

Put
A PANDA IN YOUR PURSE
A PANDA IN YOUR POCKET
A PANDA IN YOUR PACK
ROSE PETAL®
PANDA
PACK
Made from
100% impported wood pu
At school, at work or while shopping, hygienic and disposable tissues – so easy to carry!
Hygienic, disposable, easy to carry.
NEED OF THE DAY
A PRODUCT OF PACKAGES LTD.

کیچپ تو صِرف
AHMED'S
Tomato
Ketchup
AHMED
Tomato Ketchup
احمد
ٹماٹو کیچپ

پیسے ہی پیسے
Salute
ROYAL CROWN COLA
RC
Pakista
اب آرسی کولا سیلوٹ اورنج اور پاکستا آئسکریم سوڈا کے ہر کراؤن میں ۵ پیسے سے لیکر ۱۰۰۰ روپے تک کے انعامات رکھ دیئے گئے ہیں!
5 پیسے
25 پیسے
50 پیسے
1 روپیہ
5 روپے
50 روپے
100 روپے
500 روپے
1000 روپے
فری RC
اپنی پسند کی بوتل پیئیں، کراؤن دکاندار کو دیں اور اسی وقت پیسے لیں۔
ROYAL CROWN COLA
RC
(Franchised Bottlers of RC Cola USA)
CONTINENTAL BEVERAGES (PVT) LTD.
Plot D-210 Estate Avenue, S.I.T.E. Karachi - Pakistan
Phones: 295497 - 295631 - 297566

# سرکہ اور سلاد
# تن دُرست ۔ دل شاد

خالِص سرکہ کا استعمال ماہرینِ طب کے مُطابق بہت سے امراض کا علاج بھی ہے اور ان سے بچاؤ کی تدبیر بھی۔ خاص طور پر گرمی اور برسات کے موسم میں خالِص سرکہ کا استعمال نہایت ضروری ہے۔

احمد فروٹ وِنیگر خالِص سرکہ ہے جو پھلوں سے تیار کیا جاتا ہے اور عام بازاری سرکہ کے مقابلے میں صحت کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے۔

Goldfish
Deluxe Pencil
حقیر
سی
لکیر
حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی
گولڈ فِش ڈیلکس پینسل
SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: ۲۹۶۰۰۱—۴
جہاں چلے، رواں چلے
Goldfish

سوچئے تو!!
خدانخواستہ جان پر بن آئے
اور خون کے بنا کوئی چارہ نہ ہو
آج آپ
کسی کو خون کا عطیہ دیجئے
کل کوئی
آپ کے کام آئے گا۔
منجانب
جملہ اقسام کی چھپی ہوئی تھیلیاں اور شاپنگ بیگ تیار کرنے والا معروف ادارہ
جیلانی انڈسٹریل کارپوریشن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
F. 312۔ سائٹ کراچی۔ فون نمبر ۲۹۵۶۷۹،۸۹ ـ ۲۹۷۱۶۱ ـ فیکس ۴۱۳۴۴۸

نئی نسل کے اَدب کا
بَینُ الاقوامی معیار

# آنکھ مچولی

مسلسل دُوسری بار اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کرنے والا
پاکستان کا واحد ماھنامہ


| | |
|---|---|
| مدیرِ اعلیٰ | ظفر محمود شیخ |
| مدیرِ مسئول | تجمل حسین چشتی |
| مشاورت | مشفق خواجہ امجد اسلام امجد |
| مدیرانِ اعزازی | طاہر مسعود محمد سلیم مغل |
| مجلسِ ادارت | ساجد سعید منیر احمد راشد |
| اشتہارات | محمد عرفان |
| نمائندہ امریکہ | عبدالرشید خان |

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت


ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔


ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمّہ دار نہ ہوگا۔

ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔


جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء ربیع الاوّل/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ فون نمبر ۲۹۹۱۷۸

قیمت
۱۰ روپے ۷ ریال ۷ درہم

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: افتخار رسول مطبع: مغل پرنٹنگ پریس، سائٹ، کراچی
خط وکتابت کا پتہ: ماہ نامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی نورس روڈ سائٹ کراچی

# حسین ترتیب


۱۲ تاریخ کے دریچے سے — ادارہ
۱۳ پہلی بات — اداریہ
۱۵ ڈیئر ایڈیٹر — خطوں کے جواب
۱۹ نرم دل نانا — محمد یوسف اصلاحی
۲۲ دو چھٹی — شبیر بیگ ناز
۲۵ میدانِ جنگ سے — ہما سلیم
۲۹ میرے بابا
۳۲ میں کیوں واپس نہ آؤں گا — شاہد صدف
۳۴ غریب دوست وزیراعظم — فاروق عادل
۴۰ بندر اور ناریل
۴۲ بیدار قوم ہونہار بچے — سلیم مغل
۴۹ زندگی اے زندگی — منیر احمد راشد
۵۵ انسان + گھوڑا — طاہر مسعود
۵۹ ٹھنڈے ابو — مجیب ظفر انوار
۶۳ جگنو — ضیغم حمیدی

٦٥ منتخب لطائف — ڈنڈا ڈولی
٦٩ شیخ عبدالحمید عابد — اِن سے ملیے
٧٢ آصف فرخی — چیزوں کی کہانی
٧٥ ریاض جاوید — موچی کا بیٹا
٧٩ ہانز کرسچین اینڈرسن — ماں کی کہانی
٨٧ محمد صدیق فاروقی — ماسٹر جی سے شکوہ
٨٩ م الف راشد — فنگر پرنٹس
٩١ سلام سلامی — دوسرے سیارے کی ایک کہانی
٩٧ سید نظر زیدی — آزادی
١٠٥ شازیہ فرحین — یہ دولت کہاں سے آئی
١١٠ ارم فریدی — یہ عجیب و غریب فضائی معمّہ
١١٤ محمد عمران شیخ — ایک دن میں کہانی لکھنا سیکھیے
١١٧ محمود شاہد — دس لاکھ
١٢١ ننھے ادیب — کمسن قلمکار
١٣٣ تعارف — روشن مثال
١٣٨ رمیصا سلیم — امّی ابّو کا صفحہ

# تاریخ کے دریچے سے

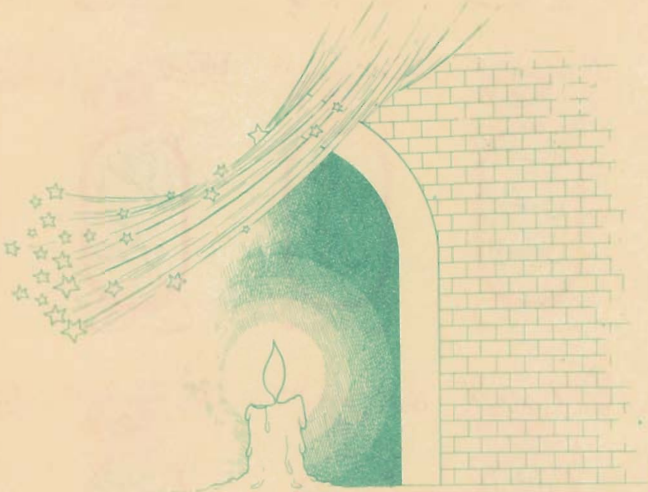

خلیفہ متوکل اپنے کسی دشمن کو زہر کے ذریعے ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے طبیب کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ اس مقصد کے لئے کوئی خاص زہر تیار کرے۔ طبیب کے لئے زہر تیار کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن خلیفہ کا مقصد برا تھا۔ اسی لئے طبیب نے زہر بنانے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ نے طبیب کو حکم نہ ماننے کے جرم میں جیل بھیج دیا۔ طبیب بیچارہ ایک سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا۔

سال بھر بعد خلیفہ نے اسے جیل سے طلب کیا اور اسے پھر زہر بنانے کا حکم دیا۔ خلیفہ سمجھتا تھا کہ طبیب جیل خانے کی زندگی سے اکتا گیا ہوگا اور اب آسانی سے زہر بنانے پر آمادہ ہو جائے گا لیکن طبیب نے اس مرتبہ بھی خلیفہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے خلیفہ سے کہا کہ علم کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہئے۔ حتیٰ کہ دشمن کو بھی۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم انسان کو آرام پہنچائیں اور اس کی تکلیفیں دور کریں۔

# پہلی بات

آپ نے اکثر ایک لفظ سنا ہو گا۔ "صلاحیت" کا لفظ۔ مگر آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ صلاحیت کس چیز کا نام ہے اور یہ کس طرح آدمی کے اندر ترقی کرتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ صلاحیت پہلے سے آدمی میں موجود نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ آدمی جب کوئی کام محنت اور مستقل مزاجی سے کرتا رہے تو اس میں اس کام کی مہارت پیدا ہو جاتی ہے اور اسی کو ہم صلاحیت کا نام دیتے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ہر شخص اپنی طبیعت اور رجحان کے مطابق ایک خاص قسم کی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ اور اگر ابتداء ہی سے اس کی صلاحیت کو پہچان لیا جائے اور اسے ویسی ہی تعلیم و تربیت دی جائے تو آگے چل کر کامیابی اور ترقی یقینی ہو جاتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو جزوی طور پر دونوں باتیں صحیح نظر آتی ہیں۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ جو آدمی اپنی صلاحیت کو پہچاننے میں دیر لگاتا ہے، اسے ترقی کرنے کے لئے محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لئے دو چیزیں بہت ضروری ہیں۔ ایک تو اپنی صلاحیت کو پہچاننا دوسرے اس صلاحیت کو ابھارنے کے لئے مسلسل محنت کرنا۔ اصل میں صلاحیت کی مثال کسی پودے کی طرح ہے۔ آپ کوئی پودا اپنے آنگن میں لگائیں اور پھر اس کی دیکھ بھال نہ کریں، اسے اس کی غذا نہ پہنچائیں تو وہ بہت جلد سوکھ کر مرجھا جائے گا۔ صلاحیت کی بھی نشو و نما نہ کی جائے تو یہ گھٹ کر ختم ہو جاتی ہے۔ لوہا کتنی مفید چیز ہے اور اس سے کتنے کام نکلتے ہیں لیکن لوہا بھی پڑے پڑے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ صلاحیت کو بھی استعمال نہ کیا جائے تو اسے بھی بیکاری اور سستی کا زنگ کھا جاتا ہے۔

ہم لوگوں کی خرابی یہ ہے کہ ہم اپنی صلاحیت کو پہچاننے اور اسے اجاگر کرنے پر توجہ نہیں دیتے۔ اس کے برعکس ہم بھیڑ چال کے عادی ہیں۔ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ڈاکٹر یا انجینئر بننے سے آمدنی زیادہ ہوتی ہے تو یہ دیکھے بغیر کہ اس کی ہم میں صلاحیت موجود ہے یا نہیں، اس شعبے میں داخلے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ اور داخلہ نہ ہو تو مایوسی اور افراتفری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنے رجحان کا صحیح صحیح اندازہ لگائیں اور اپنی صلاحیت کے مطابق مضامین کا انتخاب کریں اور پھر اس میں کامیابی کے لئے سرتوڑ محنت کریں تو ایک شاندار مستقبل کے مالک بن سکتے ہیں۔ کیوں کہ روپیہ پیسہ، عزت و شہرت یہ سبھی چیزیں صرف اور صرف اہلیت و صلاحیت سے حاصل ہوتی ہیں۔ لہٰذا آپ کو ابھی سے سوچنا چاہئے کہ آگے چل کر آپ کو کیا بننا ہے اور اس بننے کے لئے آپ کو کیا کیا تیاریاں کرنی ہیں۔ یوں بھی ہمارے ملک کو صرف ڈاکٹروں اور انجینئروں کی ضرورت نہیں اور نہ ہر طالب علم ایک اچھا ڈاکٹر اور انجینئر ہی بن سکتا ہے۔ ہمارے ملک کو کاشتکاروں، تاجروں، سائنس دانوں، معلموں، صحافیوں، مورخوں، معاشیات اور نفسیات کے ماہروں، فوجیوں، سماجی کارکنوں اور ہاتھ سے کام کرنے والوں کی بھی ضرورت ہے۔ آخر یہ ضرورت کہاں سے پوری ہوگی۔ اسے کون پورا کرے گا۔ آپ کی کوشش تو یہ ہونی چاہئے کہ آپ جس پیشے میں بھی جائیں اس میں کمال حاصل کریں۔ آپ کا نام آپ کے کام کی پہچان بن جائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ اپنے مستقبل کے لئے ابھی سے فکر مند ہوں اور محنت کو اپنا شعار بنالیں۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

# اِن پر اعتماد کیجیے

## اِن سے تعاون کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے
**آنکھ مچولی**
پہنچانے کے لیے ہم نے

اِن اداروں کو
اپنا باقاعدہ ایجنٹ
مقرر کیا ہے

محمد حسین برادرز ــــ کراچی ۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی ــــ لاہور ــ ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد ــــ راولپنڈی ــ ۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی ــــ حیدرآباد ــ ۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی ــــ پشاور ــ ۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس ــ ملتان ــ ۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو ــــ فیصل آباد ــ ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز ــــ کوئٹہ ــ ۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی ــــ گوجرانوالہ ــــ
سلمان برادرز ــــ نوابشاہ ــ ۲۴۱۴
سعید بک سٹال ــــ گجرات ــ ۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈز بکسٹال ــ سرگودھا ــ ۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی ــــ جہلم ــــ
کیپٹل نیوز ایجنسی ــــ بہاولپور ــ ۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز ــ رحیم یارخان ــ ۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو ــــ سرائے عالمگیر ــــ
رحمت بکسٹال ــــ اوکاڑہ ــــ
رہبر نیوز ایجنسی ــــ منڈی مدرسہ ــــ
ملک اینڈ سنز ــــ سیالکوٹ ــ ۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی ــــ چکوال ــــ

آنکھ مچولی خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشوروں کے لیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط و کتابت کے لیے
ماہنامہ آنکھ مچولی ۔ ڈی ۱۱۲ ۔ سائٹ • کراچی ۱۶

# ڈیئر ایڈیٹر

محمد علی انصاری، عبدالقیوم انصاری، رامسوامی کراچی ...... آپ کہتے ہیں کہ رسالے پہ تنقید کرو۔ آخر کس چیز پر تنقید کریں۔ آپ تنقید کرنے کے لئے نہ کہئے ہاں مشوروں پر ضرور کان دھریئے۔ سرورق کے لئے انعامی مقابلے کا اعلان کیجئے۔ انعامی سلسلہ رسالے کی جان ہوتا ہے۔ گھسے پٹے لطیفے شائع نہ کیا کیجئے۔

○ ...... لیجئے ایک تو ہم نے آپ کو تنقید کرنے کی آزادی دی، آپ اُلٹا بُرا مان گئے۔ چلئے صاحب نہ کیجئے تنقید۔ آپ نے جو بھی مشورے دیئے ہیں ان پر توجہ دی جائے گی۔

عظیم احمد عرف اُجّو بھائی، عزیز آباد کراچی ...... میں نے ایک چھوٹی سی تنظیم بنائی ہے اور غریب طالب علموں کے لئے کورس کی کتابوں کا بندوبست کرتا ہوں۔ ضرورت مند طالب علم مجھ سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں اور جن طالب علموں کے پاس کورس کی کتابیں ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنی استعمال شدہ کتابیں مجھے دے دیں تاکہ ضرورت مندوں کے کام آسکیں۔ میرا پتا یہ ہے۔ مکان نمبر سی ۷۳۳ عزیز آباد نمبر ۲ فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸۔

○ ...... آپ واقعی ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کے حوصلوں کو بلند رکھے۔ طالب علموں کو یقیناً آپ سے تعاون کرنا چاہئے۔

سرفراز علی، عمران علی رنگیجو ماتلی ...... آپ نے پچھلے سال دسمبر میں وعدہ کیا تھا کہ "غزل پزل" کے بعد ہم ایک نیا معلوماتی سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک یہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔

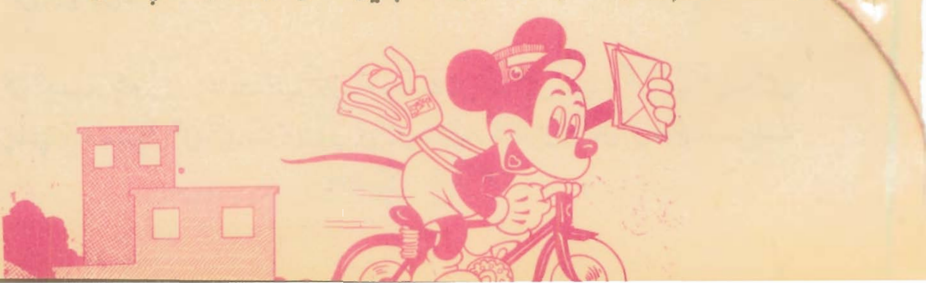

○ ...... اس کا ایک مشہور جواب تو یہ ہے کہ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔ لیکن یہ اچھا جواب نہیں ہو گا پرانے وعدے کو جلد ہی پورا کر دیا جائے گا۔ اصل میں کوئی نیا اور دلچسپ معلوماتی سلسلہ ہمیں مل نہیں سکا تھا۔

غلام مصطفیٰ، تلہ گنگ ضلع چکوال ...... انکل! کیا آپ کے رسالے میں میری تحریروں کی جگہ ہے؟

○ ...... میرے عزیز! ہمیشہ یاد رکھئے اچھی تحریر اپنی جگہ خود بنالیتی ہے۔

عظمیٰ عزیز، کراچی ...... آپ کو کئی خط لکھے مگر آپ نے شائع نہیں کئے۔ میری خواہش ہے کہ جولائی میں میرا خط شائع ہو اس لئے کہ یکم جولائی کو میری سالگرہ ہے۔

○ ...... آپ کے خط چھپنے کی باری آئی تو جولائی کا مہینہ گزر چکا تھا۔ اب تو مبارک باد بھی پرانی ہو گئی۔ پھر بھی دعا تو کبھی بھی دی جاسکتی ہے۔ ہماری نیک دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

افتخار حسین پاروی، اسکردو ...... پہلے آپ لوگ سگریٹ نوشی کے خلاف مہم میں پیش پیش تھے لیکن اِدھر چند ماہ سے آپ لوگ بالکل خاموش ہیں۔ کیا وجہ ہے؟

○ ...... ایسا نہیں ہے۔ اگر یہ خاموشی ہے تو وقتی ہے اسے آپ غفلت نہ سمجھئے۔ یہ تو رسالے کا مشن ہے۔

عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ ...... مجھے آنکھ مچولی کے سرورق سے بہت محبت ہے۔ ایک دن میرے ماموں نے کہا کہ تم آنکھ مچولی میں کہانی بھیجو۔ میں نے جواب دیا، ماموں جان۔ ان لوگوں نے تین سال میں میرا خط تو شائع کیا نہیں، کہانی کیا شائع کریں گے؟

○ ...... اوہو یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ بھئی کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا۔ دیکھئے آخر خط شائع ہوا یا نہیں۔

محمد شعیب، پشاور ...... سنا ہے آپ تعریف کو رسالے میں جگہ نہیں دیتے۔ اگر آپ تعریف نہیں چھاپتے تو ہمارے پاس بھی تنقید کے تیروں کی کمی نہیں۔ ثاقبہ رحیم الدین کی کہانی اسی ماہ ایک اور رسالے

میں بھی شائع ہوئی تھی۔

○ ...... تنقید کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ ہر ساتھی کو رسالے میں کیڑے نکالنا ضرور ہے۔ بھئی جو صحیح بات ہے وہ لکھنی چاہئے۔ ثاقبہ رحیم الدین صاحبہ نے جب کہانی ہمیں بھیجی تھی تو انھیں کسی اور رسالے کو کہانی نہیں دینی چاہئے تھی۔ چھوٹوں کو تو ہم سمجھا سکتے ہیں ان بڑوں کو کون سمجھائے۔

علی اصغر سیال، نواب شاہ ...... غضب خدا کا اس بار دو صفحات پھر کم تھے، پچھلے ماہ ۱۴۰ صفحات تھے اور اب ۱۳۸۔ معلوم ہوتا ہے رسالہ آہستہ آہستہ ختم ہی ہو جائے گا۔

○ ...... خدا نہ کرے۔ آپ کو دو صفحے کم ہوتے ہوئے تو نظر آ گئے لیکن بھائی آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک چھوٹا موٹا سا رسالہ بھی ہم پڑھنے والوں کو دے رہے ہیں۔

عبدالحفیظ شاہد، مخدوم پور ...... انکل :۔ سید غلام جیلانی کی تحریر "کورسان کی چٹانیں" ایک اور رسالے میں ان ہی کے نام سے چھپ چکی ہے۔ آپ ان کے خلاف ایکشن ضرور لیجئے۔

○ ...... ہاں بھئی۔ بعض بچے دوسروں کی تحریریں نقل کرتے ہیں۔ ہمارے یہ بڑے لکھنے والے خود اپنی ایک تحریر نقل کر کر کے بیک وقت کئی رسالوں میں چھپوا دیتے ہیں۔ آپ ہی لوگ کوئی علاج بتائیے۔

عثمان احمد زبیری، ناظم آباد کراچی ...... اگست کے شمارے میں ایک تصویر دیکھی کہ ایک صاحب کی زبان بہت زیادہ لٹک گئی ہے۔ بہت عبرت ہوئی۔ اس کا علاج یہ ہے ............

○ ...... محترم! جن صاحب کی زبان آپ نے لٹکی ہوئی دیکھی۔ وہ اپنا علاج کرانے پر تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ اس زبان کی وجہ سے انھیں دنیا بھر میں شہرت مل چکی ہے۔

عائشہ احمد، شاہ جام پور ...... لیجئے میں دوبارہ حاضر ہو گئی ہوں، بلکہ نازل ہو گئی ہوں کسی بلائے جاں کی طرح۔ آپ کو میری کوشش پسند نہیں آئی۔ ٹرائی ٹرائی اگین کے مطابق لیجئے اب بتائیے۔ ہیں کیا کہا۔ آپ کی پیٹو ردی کی ٹوکری کھا گئی۔ خیر، راحت صلاح الدین صاحبہ سے قلمی دوستی کرنا چاہتی ہوں۔

○ ...... آپ بلائے جاں تو نہیں۔ ردی کی ٹوکری کے حق میں دعا کیجئے یہ تو ہمارے قابو سے بھی باہر

ہے۔ راحت صلاح الدین صاحبہ تک آپ کی خواہش پہنچ جائے گی۔

راشد حمید فاروقی، لیاقت آباد کراچی ...... آنکھ مچولی کا آئندہ شمارہ "سائنس نمبر" ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اس پاک وطن کو سائنس دانوں کی بہت ضرورت ہے۔ اس سے طالب علموں میں سائنس کے مضمون سے دلچسپی بڑھے گی۔
○ ...... کہتے ہیں بڑے لوگ ہمیشہ ایک ہی انداز سے سوچتے ہیں۔ ہم خود بھی "سائنس نمبر" نکالنا چاہتے ہیں۔ آپ کی تجویز منظور۔ بس اب ذرا اس کی تیاری کرنے دیجئے۔

عدنان محمود صدیقی، لطیف آباد حیدر آباد ...... ڈیئر ایڈیٹر صاحب! میرے سلام کا جواب ضرور شائع کیجئے۔ ضرور ...... ضرور ...... ضرور، ورنہ، ورنہ، ورنہ!
○ ...... وعلیکم السلام۔ ویسے پورے صفحے پر آپ کو لکھنے کے لئے کوئی اور کام کی بات نہ سوجھی۔

افشاں غوری، حیدر آباد ...... آپ "دوستی نمبر" شائع کیجئے۔ اور اس کے ساتھ دوستی کے موضوع پر ایک کتاب بھی تحفے میں دیجئے۔
○ ...... کیوں بھئی۔ کہیں آپ کی اپنی دوستوں سے لڑائی وغیرہ تو نہیں ہو گئی ہے؟

حزب اللہ خان، ٹکواڑہ، ڈیرہ اسمٰعیل خان ...... کیا جب ہم موت کے منہ میں آجائیں گے تب آپ ہمارا خط شائع کریں گے؟
○ ...... موت کے منہ میں جائیں آپ کے دشمن۔ ایسی باتیں لکھ کر آپ ہمیں کیوں دہلاتے ہیں۔

محمد ادریس قریشی، منڈی بہاؤ الدین ...... آپ "شکاریات نمبر" شائع کیجئے۔ جس میں مشہور شکاریوں کے حالات، جنگلی جانوروں کی خصوصیات، ان کے رہن سہن کے طریقے، شکاریات پر کہانیاں، مضامین اور تصویریں بھی ہوں۔ تحفے میں ایک رنگین جنگل بُک دیجئے۔
○ ...... بہت اچھی اور مزیدار تجویز ہے اور ہم نے اسے جھٹ پٹ اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا ہے۔

# نرم دل نانا

محمد یوسف اصلاحی

خدا کے رسول ؐ اپنی مسجد میں خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ مسجد میں حضرت حسن ؓ اور حضرت حسین ؓ بھی آ رہے ہیں، مسجد کے صحن میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نانا جان کے پاس جلد پہنچنا چاہتے ہیں، لیکن قدم لڑکھڑا رہے ہیں اور ہر قدم پر خطرہ ہے کہ کہیں گر نہ جائیں۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے، سرخ جوڑا پہنے بڑے پیارے لگ رہے ہیں، ننھی ننھی ٹانگیں لرز رہی ہیں اور وہ نانا جان کی طرف بڑھ رہے ہیں، خدا کے رسول ؐ کچھ دیر تک تو دیکھتے رہے، مگر ضبط نہ کر سکے، ممبر سے اترے نواسوں کو آغوش میں لیا، اور سے جاکر اپنے سامنے بٹھالیا۔

بات فرمائی ہے۔

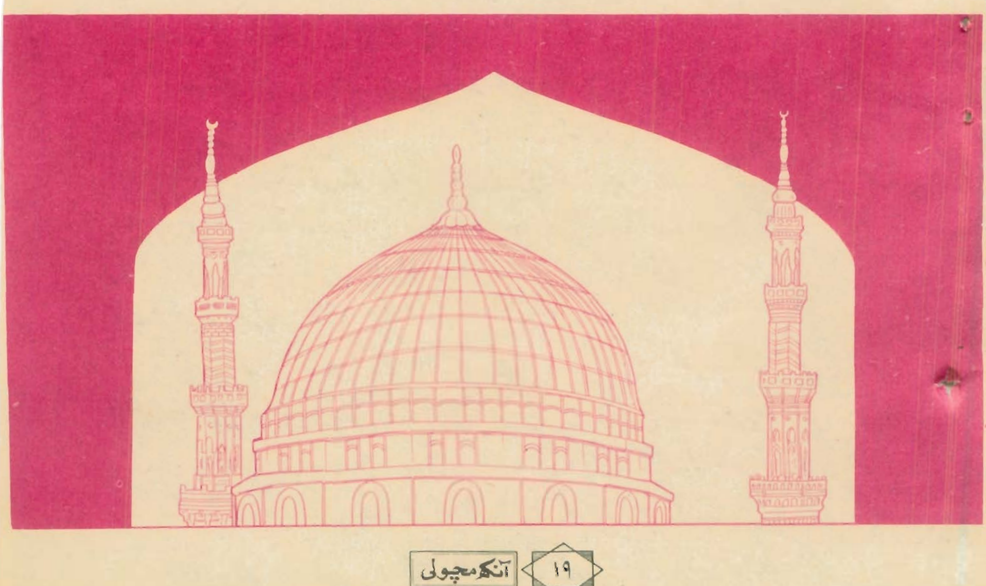

"حقیقت میں تمہارے مال و دولت اور تمہاری اولاد تمہارے لئے ذریعہ آزمائش ہیں۔"

آپ اکثر فرمایا کرتے، "حسینؓ میرا ہے اور میں حسینؓ کا، خدا اس سے محبت رکھے جو میرے حسینؓ سے محبت رکھتا ہے"۔

حضرت حسنؓ یا حسینؓ محبت کرنے والے نانا کے پیروں پر پیر رکھے کھڑے تھے۔ آپؐ نے دونوں ہاتھ پکڑے اور فرمایا بیٹے اور اوپر چڑھ آؤ، اور وہ اوپر چڑھتے چڑھتے اس سینے پر چڑھ آئے، جس میں پوری انسانیت کا درد تھا، نانا جان نے پیار سے نواسے کا منہ چوما اور خدا سے التجا کی "پروردگار! میں اس سے پیار کرتا ہوں تو بھی اس سے پیار کر"۔

خدا کے رسولؐ کسی کے یہاں مدعو تھے، تیز تیز قدموں سے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے رک گئے۔ پیارے نواسے حضرت حسینؓ راستے میں کھیل رہے تھے۔ آپؐ نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے، اور نواسے کو سینے سے لگانے کیلئے بلایا۔ حضرت حسینؓ ہنستے اور دوڑتے ہوئے آتے مگر پاس آکر ہر بار کترا جاتے اور بچ کر نکل جاتے آخر ایک بار پکڑ میں آگئے۔ حضورؐ نے ایک، ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر رکھا اور ایک ہاتھ ان کے سینے پر، اور مبارک سینے سے جوش محبت میں چمٹا لیا اور پھر بڑے پیار سے فرمایا "حسینؓ میرا ہے اور میں حسینؓ کا ہوں۔"

آپؐ ایک شاہراہ سے گزر رہے ہیں، پیارا نواسہ اس کندھے پر سوار ہے، جس پر پورے عالم کی قیادت کا بوجھ تھا۔ راہ میں کسی نے کہا، "کیا اچھی سواری ہاتھ آئی ہے تمہیں، صاحب زادے"! پیار کرنے والے نانا نے کہا، "سوار بھی کیسا اچھا ہے۔"

خدا کے رسولؐ نماز پڑھ رہے ہیں وہ نماز جس کے خلوص اور خشوع و خضوع کی کوئی رمق بھی مل جائے، تو پوری امت کی نماز، نماز ہو جائے۔ اسی دوران ایک پیاری معصوم بچی آتی ہے اور کندھے پر سوار ہو جاتی ہے، آپؐ رکوع میں جانا چاہتے ہیں اور بچی کندھے پر سوار ہے۔ آپؐ نہایت نرمی سے پیاری بچی کو کندھے سے اتار دیتے ہیں، اور خدا کے حضور رکوع اور سجود کرتے ہیں، پھر کھڑے ہوتے ہیں تو بچی پھر سوار ہو جاتی ہے، نماز سے فارغ ہوتے ہیں تو پیاری نواسی کو نہ ڈانتے ہیں نہ جھڑکتے ہیں بلکہ جوش محبت میں سینے سے لپٹا لیتے ہیں۔

ایک بار خدا کے رسولؐ کے پاس کچھ تحفے آئے، اچھے اچھے تحفے، ان تحفوں میں ایک سنہرا خوبصورت ہار بھی تھا یہی بچی ایک کونے میں کھیل رہی تھی، خدا کے رسولؐ نے فرمایا، یہ ہار تو میں اپنے گھر والوں میں سے اسے دوں گا جو مجھے بہت زیادہ پیاری ہے، لوگوں نے سمجھا کہ ضرور آپ یہ ہار حضرت عائشہؓ کے گلے کی زینت بنائیں گے۔ مگر آپؐ نے کھیلنے والی پیاری بچی کو اپنے پاس بلایا، پیار کیا، اور

اپنے مبارک ہاتھوں سے وہ ہار پیاری نواسی امامہؓ کے گلے میں ڈال دیا۔

شفیق نانا پیارے نواسے حسینؓ کو پیار کر رہے تھے، اسی دوران مکے کے ایک دولت مند سردار اقرع بن حابسؓ بھی خدمت میں حاضر ہوئے اقرع بن حابسؓ نے یہ منظر دیکھا تو انہیں حیرت ہوئی کہ اتنی عظیم ہستی بچوں کو اس طرح پیار کر رہی ہے اور اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

"مجھے خدا نے دس بچے دے رکھے ہیں، مگر میں نے تو آج تک کسی ایک بچے کو بھی پیار نہیں کیا ہے۔" رحمت عالمؐ نے فرمایا جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا خدا بھی اس پر رحم نہیں کرتا"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے "حسنؓ اور حسینؓ میرے گلدستے ہیں"۔ جب کبھی آپؐ اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کے یہاں تشریف لے جاتے تو حضرت فاطمہؓ زہرا سے فرماتے، "فاطمہؓ! میرے بچے کہاں ہیں لاؤ انہیں"۔ وہ دونوں بیٹوں کو آپؐ کے پاس لاتیں، آپؐ ان کو سینے سے لپٹاتے، پیار کرتے اور ان کے رخساروں پر اپنا منہ اور ناک رکھ کر اس طرح پیار فرماتے گویا سونگھ رہے ہیں۔

پیاری بیٹی زینبؓ نے اپنے شفیق باپؐ کے پاس قاصد بھیجا اور کہلوایا میرے بچے کی جان کنی کا نازک وقت ہے، ذرا دیر کیلئے تشریف لے آیئے۔ خدا کے رسولؐ کے پاس پیغام پہنچا تو قدرتی طور پر غمزدہ ہوئے، ضبط سے کام لیا اور قاصد سے کہلا بھیجا "بیٹی تم پر سلامتی ہو، جو کچھ خدا نے لے لیا وہ خدا ہی کا ہے اور جو کچھ اس نے عطا فرما دیا وہ بھی خدا ہی کا ہے، ہر چیز کا اس کے یہاں وقت مقرر ہے...... بیٹی! صبر سے کام لو، خدا تمہیں ضرور اس کا بہترین صلہ دے گا"۔

حضرت زینبؓ بچے کی جان کنی کا منظر دیکھ کر بے حال تھیں۔ جگر گوشہ گود میں پڑا اپنی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا، آپؓ نے پھر قاصد بھیجا اور کہلوایا، حضورؐ ضرور تشریف لائیں بڑا سخت وقت ہے، حضورؐ اسی وقت کھڑے ہوئے۔ آپؐ کے ہمراہ حضرت سعدؓ بن عبادہ، معاذؓ بن جبل، ابیؓ ابن کعب، زیدؓ بن ثابت اور کچھ دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی تھے۔ خدا کے رسول بیٹی کے یہاں پہنچے تو بچے کو آپ کی گود میں دیا گیا۔ بچے کی جان کنی ہو رہی تھی، معصوم بچہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا، نواسے کی یہ کیفیت دیکھ کر بے اختیار آپ کی آنکھوں سے آنسو ٹپا ٹپ گرنے لگے۔

سعدؓ بن عبادہ بولے "یا رسولؐ اللہ! کیا آپؐ رو رہے ہیں"؟ ارشاد فرمایا "یہ رحم ہے رحم، جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ انہی بندوں پر رحم فرماتا ہے، جو آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں"۔

# دوچھتی

شبین بیگ ناز

میرے گھر کی دو چھتّی ہے بھان متی کا تھیلا
الم غلم بھرا ہے اس میں پیٹ ہے اس کا پھیلا
زنگ آلود پڑے ہیں برتن تانبے اور پیتل کے
رکھے ہیں ناکارہ پرزے بہت پرانے نل کے
گھر بھر کے سب پھٹے پرانے شوز آباد ہیں اس میں
اور سعدی کے پلنگ پنگھوڑے زندہ باد ہیں اس میں
بان پرانا ہے اک جانب اپنا رنگ جمائے
دو چھتی کی آبادی کی غزلیں روز سنائے
چڑیوں نے بھی بڑھ چڑھ کر ہے اپنا فرض نبھایا
دانا دُنکا کنکر پتھر سب کچھ یہیں سمایا
چوہوں نے بھی اپنے جسم و جاں سے اسے نوازا
پیدا کر رکھے ہیں اس میں بچّے بے اندازہ
اس بے چاری دو چھتی میں اتنا مال ٹھنسا ہے
ناز کہ اس کو سانس بھی لینا اب دشوار ہوا ہے

دو چھتی عموماً گھروں میں چھت کے نیچے زائد سامان رکھنے کے لئے بنا دی جاتی ہے۔

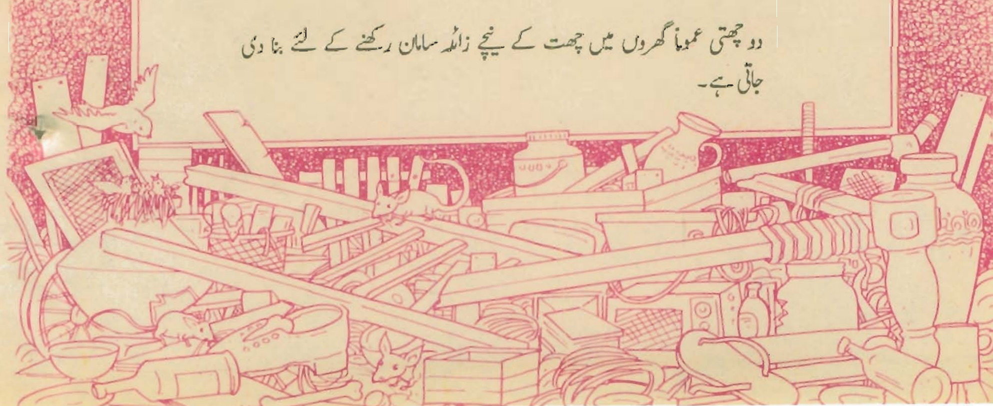

# تتلی

کمسن طلباء و طالبات کے لیے

آنکھ مچولی کا

دلچسپ تحفہ

# کیا سمجھے؟

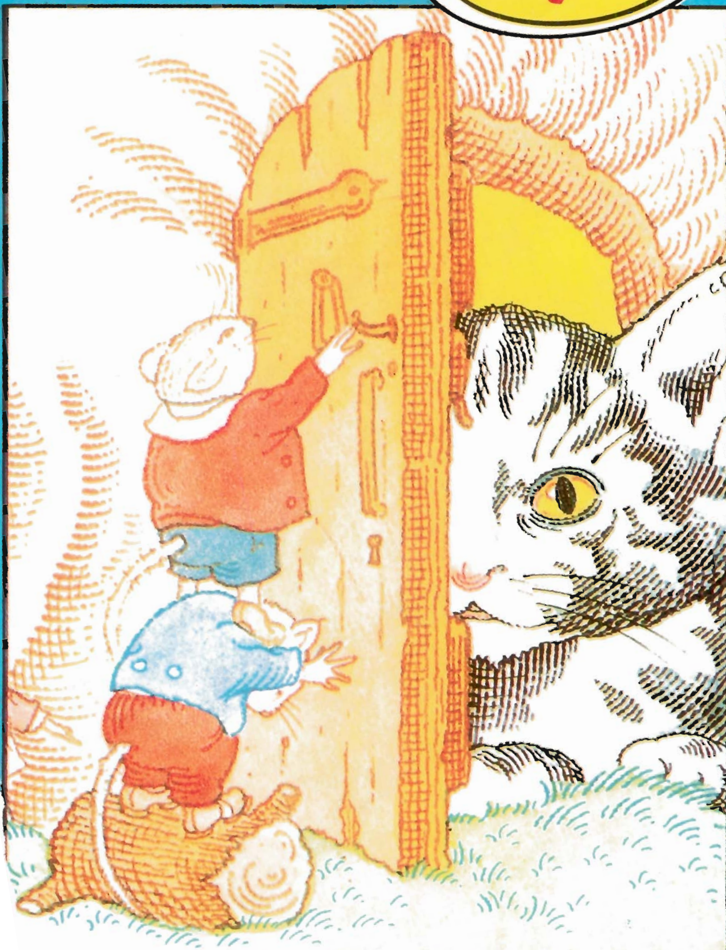

ں تصویر کو دیکھ کر آپ جو کچھ بھی سمجھتے ہوں اس پر ایک چھوٹی سی
لچسپ کہانی لکھ کر آنکھ مچولی کے پتے پر بھجوا دیجئے۔

کہانی شائع ہونے پر

# نوشیرواں کا انصاف

حسن اعجاز، صادق آباد

بہت زمانہ ہوا۔ ایک بادشاہ گزرا ہے، جس کا نام نوشیرواں تھا۔ نوشیرواں اپنے انصاف کے لئے بہت مشہور ہے۔ ایک مرتبہ نوشیرواں نے ایک محل بنوانے کا حکم دیا۔ لیکن جس جگہ وہ محل بنوانا چاہتا تھا اِس کے پاس ایک بڑھیا کا جھونپڑا تھا۔ محل بنانے والے کاریگر نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ اگر یہ جھونپڑا یہاں سے ہٹ جائے تو محل کے لئے اور زیادہ زمین نکل آئے گی۔

بادشاہ نے بڑھیا کو بلا کر کہا "اماں! تم اپنا یہ جھونپڑا مجھے دے دو اس کے بدلے میں میں تم کو ایک پکا مکان رہنے کے لئے دوں گا۔"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "میں ایسا کیوں کروں؟ میرے باپ دادا سب اسی جھونپڑے میں رہے ہیں۔ میری اتنی عمر بھی اس میں گزری ہے۔ میں کسی کو اپنا جھونپڑا نہ دوں گی۔ میں تیری اتنی بڑی سلطنت کو خوش دلی کے ساتھ دیکھتی ہوں۔ کیا تو میرے ذرا سے جھونپڑے کو بھی نہیں دیکھ سکتا؟"

نوشیرواں بڑھیا کی بات سن کر خاموش ہو گیا اور اس نے کاریگروں کو حکم دیا کہ جھونپڑے کو چھوڑ کر محل بنایا جائے۔

محل تیار ہو گیا تو اس نے بڑے بڑے ماہرین کو جمع کر کے انہیں محل دکھایا اور پوچھا کہ اس میں کوئی خامی تو نہیں رہ گئی ہے۔ ان لوگوں نے محل کو اچھی طرح دیکھا اور کہا کہ اور تو سب ٹھیک ہے لیکن بس ایک خرابی یہی ہے کہ اس کے کونے پر جھونپڑا اس کی خوبصورتی کو کم کر رہا ہے۔ جھونپڑے سے اٹھنے والے دھوئیں سے محل کی دیوار بھی کالی پڑ جائے گی۔ اگرچہ جھونپڑا یہاں سے ہٹا دیا جائے تو بہت اچھا ہو۔

نوشیرواں نے بڑھیا کو پھر بلایا اور کہا کہ میں تجھ سے تیرا جھونپڑا نہیں مانگتا۔ صرف میری ایک بات مان لے کہ تو اپنے جھونپڑے میں روٹی نہ پکایا کر میں اپنے محل سے تیرے لئے روزانہ پکا پکایا کھانا بھجوا دیا کروں گا۔

بڑھیا نے بادشاہ کی یہ بات بھی نہ مانی اور کہنے لگی۔ "مجھے میرا روکھا سوکھا کھانا ہی اچھا۔ تیرا حلوا مجھے نہ چاہئے۔"

نوشیرواں نے پھر اس بڑھیا سے کچھ بھی نہ کہا اور آج نوشیرواں کا بنوایا ہوا یہ محل نہیں ہے لیکن اس محل سے متعلق یہ کہانی نوشیرواں کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

# آفت کی پڑیا

علی اکمل مستقیم ...... قصور

میری بھانجی گڑیا ہے
آفت کی اک پڑیا ہے
پیار کروں تو روٹھ یہ جائے
گود میں آنے سے گھبرائے
شیر کی طرح حکم چلائے
لیکن بلی سے ڈر جائے
پوچھے جب کوئی اس کا نام
بولے میں ہوں مہوش خان

# نیک دل کبڑا

قرۃ العین طاہر

کسی ملک میں ایک شخص رہتا تھا اس کا نام جبران تھا۔ جبران ویسے تو ایک اچھا آدمی تھا لیکن بدقسمتی سے وہ کبڑا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ دیکھنے میں بُرا لگتا تھا۔ اسی لئے سب لوگ اسے مذاق اڑانے والی نظروں سے دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔ جبران بہت افسردہ رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اسے اچھی نظروں سے دیکھیں اور اس سے اچھی طرح پیش آئیں۔ لیکن یہ بات لوگوں کو کون سمجھاتا۔

اس دن جبران باغ میں بہت اداس بیٹھا تھا۔ کیونکہ جب وہ اپنے گھر سے چلا تھا تو راستے میں کچھ لڑکے اسے دیکھ کر ہنسنے لگے تھے اور نعرے لگانے لگے تھے۔ ''کبڑا'' ''کبڑا'' ''وہ دیکھو کبڑا جارہا ہے۔''

لڑکوں کا شور سن کر جبران پہلے تیز تیز چلنے لگا، پھر وہ بھاگتا ہوا باغ میں پہنچ گیا۔ تاکہ سب لوگوں کی نظروں سے چھپ جائے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جب روتے روتے اس کا چہرہ بھیگ گیا تو اس نے دعا کی کہ ''اے خدا! تو نے مجھے کس گناہ کی سزا دی ہے؟ مجھے کیوں کبڑا پیدا کیا؟''

ابھی وہ دعا مانگ ہی رہا تھا کہ اسے اچانک پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک بہت خوبصورت پری کھڑی تھی۔ اس کے دونوں پر سنہری رنگ کے تھے اور اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس کے آخری سرے پر ایک ستارہ جگمگا رہا تھا۔

"تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں آئی ہو؟" جبران نے پوچھا۔

"میں ایک پری ہوں اور تم سے ملنے آئی ہوں۔" پری نے کہا۔

"تم چلی جاؤ۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔" جبران نے کہا۔

"تم تو کچھ ناراض لگتے ہو؟" پری نے ہنس کر کہا۔

"ہاں میں ناراض ہوں ...... کیونکہ خدا نے مجھے کبڑا پیدا کیا ہے اور سب لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔" جبران نے افسردگی سے کہا۔

"پریشان مت ہو۔ آج کے بعد کوئی تمہارا مذاق نہیں اڑائے گا۔" پری بولی۔

"کیا واقعی؟" جبران خوشی سے چیخ پڑا۔

ہاں ہاں، تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا ہے۔" پری اپنی چھڑی گھماتے ہوئی بولی، چھڑی کے ستارے سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔

"مگر وہ کس طرح؟" جبران نے پوچھا۔

"وہ اس طرح کہ میں ان تمام لڑکوں کو کبڑا بنا دوں گی جو تمہارا مذاق اڑاتے ہیں۔ پھر وہ تمہارا مذاق نہیں اڑائیں گے۔" پری نے کہا۔ وہ بہت غصے میں لگ رہی تھی۔

یہ سن کر جبران سوچ میں پڑ گیا۔ "تو کیا میری طرح دوسرے لوگ بھی کبڑے ہو جائیں گے۔ وہ لڑکے بھی جنھوں نے میرا مذاق اڑایا تھا۔" چلو اچھا ہی ہے۔ پھر میں بھی انہیں اسی نظر سے دیکھوں گا جیسے وہ مجھے دیکھتے ہیں۔ میں بھی انھیں چھیڑوں گا۔ میں بھی چیخ چیخ کر کہوں گا "کبڑا" "کبڑا" جبران کے ذہن میں ایسے ہی خیالات آرہے تھے لیکن پھر اس کے دل نے کہا نہیں یہ بُری بات ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ تب جبران نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایسی بات نہیں کہے گا۔ اس نے کہا۔

"اچھی پری۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔"

"لیکن وہ سب تمہارا مذاق اڑاتے ہیں۔ تمہیں تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔" پری نے کہا۔

"وہ مجھے تکلیف پہنچاتے ہیں لیکن میں انھیں تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ کیونکہ یہ بُری بات ہے۔" جبران نے جواب دیا۔

پری نے یہ سن کر کہا۔ "جبران! تم واقعی ایک نیک دل انسان ہو اور ایسے اچھے آدمی کو کبھی کبڑا نہیں ہونا چاہیئے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا چھڑی کے ستارے سے روشنی کی ایک لکیر نکلی اور سیدھی جبران کی پیٹھ میں داخل ہو کر گم ہو گئی۔ جبران کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

جب اس کی آنکھیں کھلیں تو شام ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید خواب دیکھا ہے لیکن یہ کیا...... وہ تو بھلا چنگا تھا...... بالکل ویسا ہی جیسے سب لوگ ہوتے ہیں سچ ہے کہ نیک دل لوگوں کی پریشانیاں سدا نہیں رہتیں۔!

# رنگ بھریئے ...... مگر ......

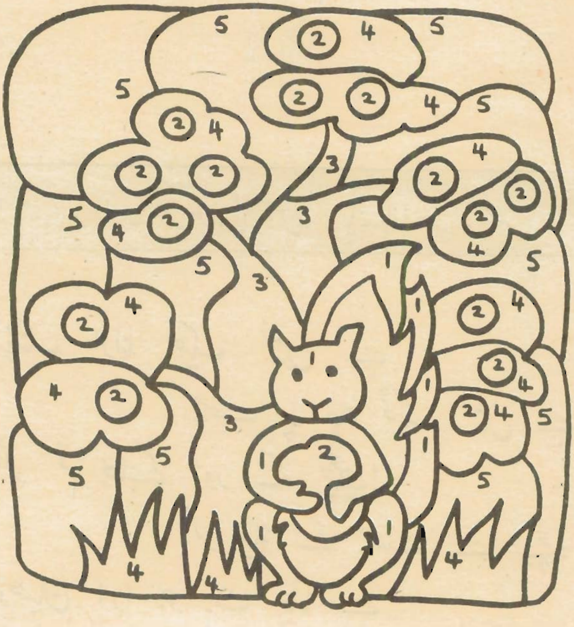


رنگ بھریئے مگر اس ترتیب سے ..........

۱۔ نارنجی۔ ۲۔ سرخ۔ ۳۔ بھورا۔ ۴۔ سبز۔ ۵ نیلا۔

# پتنگ

مرسلہ۔ **محمد عرفان میمن**، کریانہ بازار ...... سکھر

پتنگ اڑانا ٹھیک نہیں ہے
چھت پر جانا ٹھیک نہیں ہے
گر تم بھاگے ڈور کے پیچھے!
گر جاؤ گے چھت سے نیچے!
دھیان ذرا جو بٹ جاتا ہے
ڈور سے ہاتھ بھی کٹ جاتا ہے
بچو! میری بات صحیح ہے
پتنگ اڑانا ٹھیک نہیں ہے

# کاش ایسا نہ ہوتا

حنا خیری

عامر کو روئی کے گالوں جیسے ننھے منے چوزے بہت پسند تھے۔ ایک دن جب چوزے بیچنے والا آیا تو عامر امی کے پیچھے پڑ گیا کہ اسے چوزے دلا دیں "عامر بیٹے چوزوں کی حفاظت کرنا بہت مشکل کام ہے۔" امی نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں حفاظت کر لوں گا امی۔" عامر نے بڑے عزم سے کہا۔

"سوچ لو ایسا نہ ہو کہ تم حفاظت نہ کر سکو اور بے چارے چوزوں کو

بلی کھا جائے یا چیل لے اڑے۔"
"نہیں امی میں وعدہ کرتا ہوں میں چوزوں کی جی جان سے حفاظت کروں گا۔" آخر تھک ہار کر امی نے دو چوزے خرید دیئے عامر میاں بہت خوش تھے انہوں نے چوزوں کے لئے گھر میں بڑا ڈربہ ٹھیک ٹھاک کیا پھر اس میں پانی کی کٹوری اور باجرہ رکھا۔

ایک روز چوزے لان میں دانہ چگ رہے تھے اور عامر خود دور بیٹھے ہوئے تھے کہ ابو نے آواز دے کر کسی کام کے لئے بلایا۔ ابھی عامر ابو کی بات سن ہی رہے تھے کہ امی کی چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ فوراً باہر لپکے عامر نے دیکھا کہ ایک چوزے کو چیل اٹھا کر لے گئی ہے عامر نے بچ جانے والے سہمے ہوئے چوزے کو سینے سے لگا لیا اور کہا "میں تمہارے ساتھی کو تو نہیں بچا سکا مگر تمہاری حفاظت ضرور کروں گا۔"

کئی دن گزر گئے۔ عامر ہر روز رات کو سونے سے پہلے ڈربے کا دروازہ اچھی طرح دیکھ لیتا کہ کہیں کھلا نہ رہ گیا ہو۔ اس روز اسے سخت نیند آرہی تھی حالانکہ اس کے دل میں بار بار خیال آرہا تھا کہ ڈربے کا دروازہ دیکھ لے مگر سستی اور نیند کی وجہ سے وہ نہ اٹھ سکا اور نہ جانے کب اسے نیند نے آلیا۔

صبح جب اسکول جانے سے پہلے وہ ڈربے کے پاس پہنچا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا دروازہ کھلا پڑا تھا اور چوزے کے پر زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ عامر کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ سوچنے لگا "افسوس میری لاپرواہی کی وجہ سے دونوں چوزوں کی جان گئی۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔"

# چاند

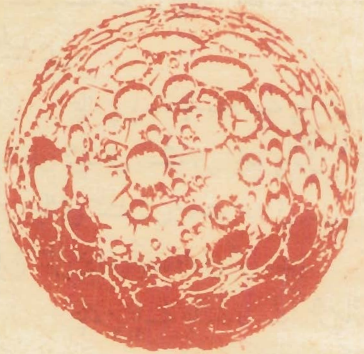

## ہمارا قریب ترین پڑوسی

مرسلہ ...... شانی، مانی، خرم

رات کے وقت چاند کو دیکھ کر ہم خوش ہوتے ہیں۔ چاند کے کالے دھبوں کو دیکھ کر کوئی کہتا ہے کہ وہاں پیڑ کے نیچے ایک بڑھیا سُوت کات رہی ہے۔ وہاں ایک خرگوش بیٹھا ہے۔ مگر سائنس دانوں نے اب بڑی بڑی دور بینوں سے یہ جان لیا ہے کہ چاند کیا ہے اور وہاں کیا کیا ہے۔

نیلے آسمان میں پائے جانے والے دیگر سیاروں کی طرح چاند بھی ایک سیارہ ہے، لیکن چاند زمین سے سب سے قریب ہے۔ زمین سے چاند کی دوری لگ بھگ دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے۔ چاند کا پیشتر حصہ پہاڑوں سے ڈھکا ہے۔ ان پہاڑوں کی پرچھائیاں ہی یہ کالے دھبے ہیں۔ کہیں کہیں ان پہاڑوں کی اونچائی ۲۶ ہزار فٹ تک ہے۔ چاند پر کئی بڑے بڑے پہاڑی سلسلے ہیں اور کئی

بڑے بڑے میدان ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق وہاں کم از کم دس پہاڑی سلسلے ہیں۔

چاند پر پائے جانے والے پہاڑوں کے نام سائنس دانوں نے یہاں کے پہاڑوں جیسے ہی رکھے ہیں ایک پہاڑی سلسلے کا نام "آلپس" رکھا گیا ہے۔ اس پہاڑی سلسلے میں سات سو بڑی بڑی چوٹیاں ہیں۔ چاند پر اسّی میل لمبی اور پانچ میل چوڑی ایک وادی بھی ہے۔

چاند پر پائے جانے والے اکثر پہاڑ آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ ان پہاڑوں کے بڑے بڑے دہانے حیران کن ہیں۔ کئی دہانے کا قطر اسّی میل تک ہے چاند پر لگ بھگ تیس ہزار آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ یہاں کئی بڑے بڑے میدان بھی ہیں ایک میدان کا نام "میٹرا مبیرئن" ہے۔ میل لمبا اور ۷۰۰ میل چوڑا ہے۔ عام طور پر چاند کی سطح چکنی اور صاف ستھری نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں ایسی نہیں ہے۔ چاند کی سطح بڑی کھردری اور ناہموار ہے۔

چاند زمین سے چھوٹا ہے۔ زمین پر رہنے والوں کو چاند کا صرف ایک ہی حصہ نظر آتا ہے۔ اوپر جو کچھ بتایا گیا ہے۔ وہ سب اس ایک ہی حصے کا ذکر ہے۔ دوسری جانب کیا ہے۔ یہ ابھی تک معلوم نہیں، ہوسکا ہے۔

چاند پر سکون اور بے آواز سیارہ ہے۔ چاند پر ہوا بالکل نہیں ہے۔ چاند پر پیڑ پودے بھی نہیں ہیں اور نہ ہی وہاں ہمارے جیسے موسم ہوتے ہیں۔ چاند کی اپنی ذاتی روشنی بھی نہیں ہے۔ وہ سورج کی روشنی سے ہی جگمگاتا ہے۔ چاند جس قدر سورج کی روشنی حاصل کرتا ہے۔ اس کا دس فیصد حصہ زمین پر پھینکتا ہے، پھر بھی وہ اس قدر روشن رہتا ہے۔

## شوخ لکیریں

کراچی سے زاہد کمال کا تحفہ

سی این این

ہینڈز اپ

لنچ ٹائم

سوچ کر کھاؤں
یا
کھا کر سوچوں

# انوکھا انعام

مرسلہ۔ شگفتہ نسیم
سعید آباد، کراچی

پیارے بچو! یہ قصہ مشرقی بنگال کا ہے۔ ایک مرتبہ وہاں موسلا دھار بارشیں ہوئیں جس کی وجہ سے مچھلیوں کی قلت ہو گئی اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ وہاں کے لوگ مچھلیاں بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ جب مچھلیاں انھیں ملنا بند ہو گئیں تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ ایک امیر شخص نے اعلان کیا کہ جو مچھیرا

میرے لئے مچھلیاں پکڑ کر لائے گا اسے میں سو روپے انعام دوں گا۔ جس زمانے کا یہ قصہ ہے اس وقت سو روپے بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ خیر، صاحب اعلان سن کر سارے مچھیرے دریا کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن قسمت نے صرف ایک مچھیرے کا ساتھ دیا۔ غریب مچھیرا جب مچھلیاں لے کر امیر شخص کے محل پہنچا تو لالچی چوکیدار نے اس کا راستہ روک دیا اور بولا کہ میں صرف ایک شرط پر تمہیں اندر جانے دوں گا کہ مالک تمہیں جو انعام بھی دے اس میں سے آدھا حصہ میرا ہو گا۔ مچھیرا بے چارہ کیا کرتا، مان گیا۔ امیر شخص مچھلیاں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے مچھیرے کو انعام میں سو روپے دیئے۔ لیکن مچھیرے نے انعام لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے امیر شخص سے کہا کہ آپ مجھے انعام میں سو جوتے ماریں۔ امیر شخص بہت حیران ہوا لیکن مچھیرے کی ضد کے آگے مجبور ہوگیا۔ اس نے اپنے ملازم کو حکم دیا کہ مچھیرے کو آہستہ آہستہ سو جوتے ماریں جائیں کیونکہ اس نے مجھے مچھلیاں لا کر دی ہیں۔ ملازم نے حکم کی تعمیل کی۔ جب مچھیرے کو پچاس جوتے پڑ چکے تو اس نے ہاتھ اٹھا کے کہا "بس اب بقیہ جوتے میرا حصہ دار کھائے گا۔" اور یہ کہہ کر اس نے چوکیدار کو بلانے کے لئے کہا اور ساتھ ہی سارا ماجرا امیر شخص کو کہہ سنایا۔ چوکیدار آیا تو امیر شخص نے حکم دیا کہ اسے پورا انعام ملنا چاہئے اور سو جوتے خوب زور زور سے مارے جائیں اور اس کے بعد نوکری سے نکال دیا جائے۔ اور پھر اس نے مچھیرے کو خوب سارا انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ چوکیدار کو رشوت مانگنے کی سخت سزا ملی تو اس نے آئندہ ایسی حرکت سے توبہ کرلی۔

# حیرت کی بات ہے نا؟

عام طور پر ایک انناس میں سے ایک یا دو کپ جوس نکلتا ہے مگر دیکھئے تو اس انناس میں ایک لاکھ گیلن رس کی گنجائش موجود ہے۔ یہ انناس دراصل پانی کا ایک ۸۰ فٹ اونچا ٹینک ہے جسے ہونولولو (ہوائی) میں تعمیر کیا گیا ہے

یہ کیا ہیرے کا تراشا ہوا ڈیزائن ہے؟ شیشے کا کوئی پھول یا پھر کوئی کرسٹل؟ جی نہیں یہ برف کے ایک ذرّے کی تصویر ہے جو اپنے اصل سائز سے ۷۵ گنا بڑی ہے۔

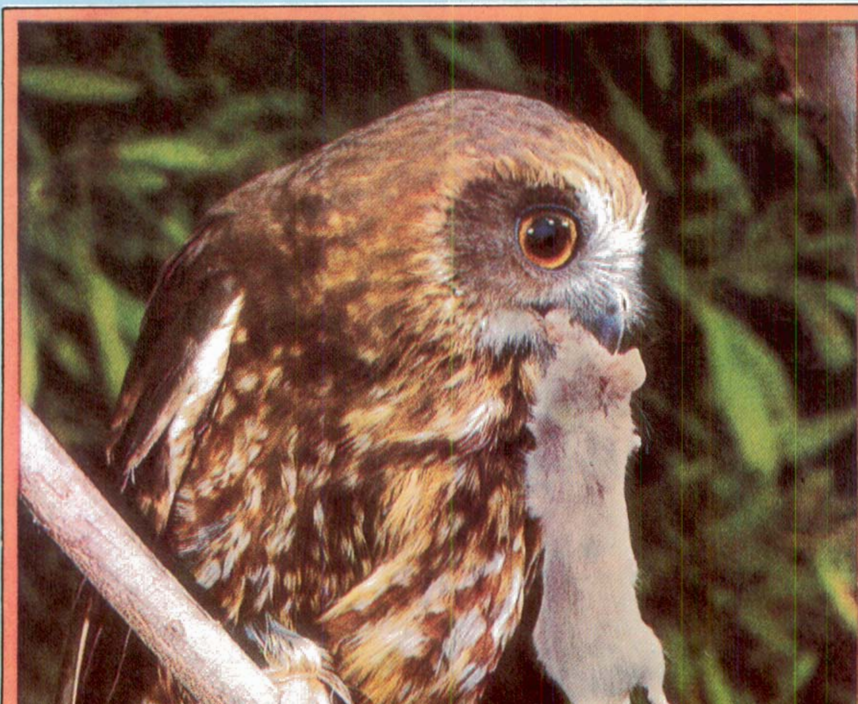

زمانے بھر میں چوہوں کا یہی انجام ہوتا ہے

# بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سُلگائیں

**آنکھ مچولی کا دلچسپ مقابلۂ مصوّری**

کراچی سے محمد یاسر خاں کی کاوش

کراچی سے محمد علی انصاری کی دو اچھوتی اور دلچسپ تخلیقات

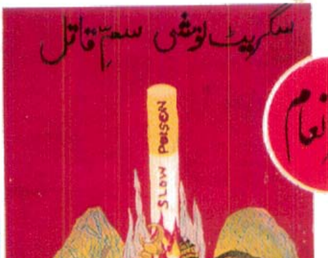

سنجوال ضلع اٹک سے زیب النساء عوزی کے دو خوبصورت پوسٹر

منڈی بہاؤالدین (گجرات) کے پرنس آف پاکستان کے موضوع کو یوں سمجھا

# ہر گھڑی تیار کامران ہیں ہم

## شہدائے ستمبر کو

### کراچی پبلک اسکول کے بچّوں کا خراجِ عقیدت

وطن کی حفاظت کے لئے ہر لمحہ تیار

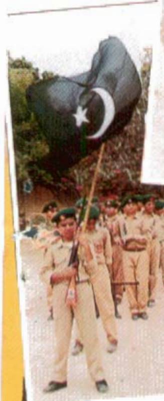

سبز پرچم تلے
ہر سپاہی چلے

پیش قدمی کا ایک انداز

پنجاب رجمنٹ کی ایک چوکی

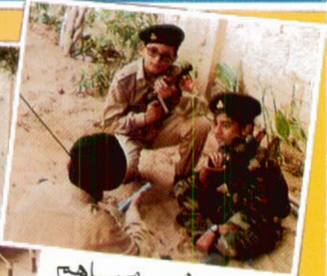

کچھ مشورے باہم

حملے کے حکم کا انتظار

میجر طفیل کو کرنل کی ہدایت اور شاباش

دشمن کی ایک کمین گاہ

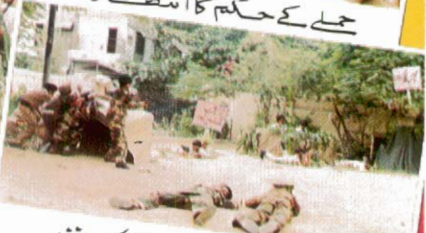

لکشمی پور کے قریب جنگ کا ایک منظر

شہیدوں کو سلام عقیدت

زخمی میجر طفیل
اور
بھارتی کمانڈر
کی لاش

# جنگ کی روداد
## میدان جنگ سے

ہما سلیم

### ایک فیصلہ کن اور سنسنی خیز جنگ کا احوال

میدان جنگ میں کھڑے ہو کر جنگ کا نظارہ کرنا، یا تو خود جنگ لڑنے والوں کو نصیب ہوتا ہے یا پھر مغربی صحافیوں کو، ہم جیسے لوگ تو اس منظر کو دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن آپ یقین کیجئے کہ جس جنگ کا ذکر ہم یہاں کر رہے ہیں اسے ہم نے خود اپنی ۔۔۔۔۔ آنکھوں سے دیکھا اور بہت ہی قریب سے دیکھا، دو طرفہ فوجوں کی دوبدو لڑائی میں کئی بار تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی گولی سنسناتی ہوئی ہمارے کان کے قریب سے گزر گئی ہو عجیب منظر تھا وہ، ہر طرف گولیوں کا شور، فائرنگ کی آوازیں، زخمیوں کی آہ و بکا اور فلک شگاف نعرے۔ گھمسان کی اس جنگ میں پاکستانی فوجیں مسلسل آگے بڑھ رہی تھیں پیش قدمی کرنے والے مجاہدوں میں سے اگر دو شہید ہوتے تو دس مجاہد شہادت کے جذبے سے سرشار آگے بڑھ جاتے، انہیں ہر صورت میں دشمن کے ٹھکانوں تک پہنچ کر اسے نیست و نابود کرنا تھا، جوانوں کے جذبے

بتا رہے تھے کہ وہ آخری فتح یا آخری شہادت کا عزم لے کر نکلے ہیں۔

پاکستانی افواج نے دشمن سے پاک سرزمین کا وہ علاقہ واپس لینا تھا جسے اس نے مکاری اور عیاری سے ہتھیا لیا تھا۔ اس ہولناک جنگ میں ہم نے اپنے حوصلے کو ٹٹولا تو بالکل سالم پایا۔ ہم پر ذرہ برابر بھی خوف کی کیفیت نہیں تھی۔ شائد اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ جنگ سچ مچ کی نہیں تھی بلکہ اس کے سبھی کردار بچے تھے۔ یہ سب بچے کراچی پبلک اسکول کیمبرج برانچ کے طالب علم تھے ان بچوں نے پاکستان کی خاطر جان کا نذرانہ دینے والے شہیدوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے یہ انوکھا انداز

حملے کی حکمت عملی کرتے ہوئے، کرنل آصف اور میجر طفیل

اختیار کیا کہ وہ خود فوجیوں کے روپ میں ڈھل گئے اور میدان جنگ کا ایسا نقشہ کھینچ ڈالا کہ دیکھنے والے بھی حیرت کی تصویر بن گئے۔

۵ ستمبر کی صبح کا سورج نمودار ہوا تو اسکول کا میدان جنگ کا سماں پیش کر رہا تھا چاروں طرف مورچے بنے ہوئے تھے۔ دشمن کی کمین گاہیں بھی تیار تھیں اور سرحدوں پر خار دار باڑیں بھی۔ پاکستانی علاقے میں پنجاب رجمنٹ کا کیمپ لگا ہوا تھا اور اس پر پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا۔ دشمن کے مورچوں پر بھارتی پرچم نظر آرہا تھا اور قریب ہی بڑا بڑا سا لکھا ہوا تھا۔ "لکشمی پور۔"

جس معرکے کی تاریخ یہاں دہرائی جانے والی تھی یا جس جنگ کا طبل بجنے والا تھا یہ جنگ پاکستان اور بھارت کی فوجوں کے مابین ۷ اگست ۵۸ء کو مشرقی پاکستان کے علاقے لکشمی پور میں ہوئی۔ یہی وہ جنگ ہے جس میں شجاعت کی نئی تاریخ رقم کرنے والے میجر طفیل نے شہادت پائی اور انہیں شہادت کے بعد نشان حیدر کا اعزاز عطا کیا گیا۔

"شہید کبھی مرا نہیں کرتے" یہ اللہ کا فرمان ہے۔ وہ اپنے ظاہری اور باطنی وجود کے ساتھ تو زندہ رہتے ہی ہوں گے مگر ان کا نام کس طرح زندہ رہتا ہے یہ منظر تو ہم نے آنکھوں سے دیکھا۔ شہادت کے ۳۳ سال بعد آج کراچی پبلک اسکول کا کمسن طالب علم زین کامل اپنے کشادہ سینے پر شجاعت کے بیج سجائے ہوئے میجر طفیل کا رول ادا

دشمنوں کی کمین گاہ

کر رہا تھا۔ میجر طفیل نے کرنل آصف سے نئی ذمہ داریاں اور کچھ ہدایات حاصل کرنے کے بعد پنجاب رجمنٹ کے جوانوں کے سامنے ایک پرجوش تقریر کی اِن کے جذبۂ جہاد کو بیدار کیا اور اپنی حکمت عملی سے آگاہ کرنے کے بعد حملے کی تیاری کا حکم دیا۔

پاکستانی فوج کا مارچ پاسٹ شروع ہوا تو میدان کے چاروں اطراف ایک نغمہ گونجا اور روح کی گہرائیوں میں اتر گیا

ہر گھڑی تیار کامران ہیں ہم
جیسے ہوں حالات شادمان ہیں ہم

فوجیوں کے روپ میں ننھے اور کمسن بچوں کے چہروں کو دیکھ کر ایسا لگتا جیسے وہ سچ مچ جہاد پر جانے کے لئے تیار ہو کر آئے ہوں۔ لڑتے ہوئے،

دو بھارتی فوجی اپنے انجام سے بے خبر

آگے بڑھتے ہوئے، گولیاں کھا کر گرتے ہوئے، کوئی بھی ایسا لمحہ نہ ہو گا جب ان کے چہرے کے وقار اور سنجیدگی میں ذرّہ برابر بھی کمی آئی ہو اس پورے منظر کو دیکھنے والا کوئی ایسا شخص نہ ہو گا

آنکھ مچولی

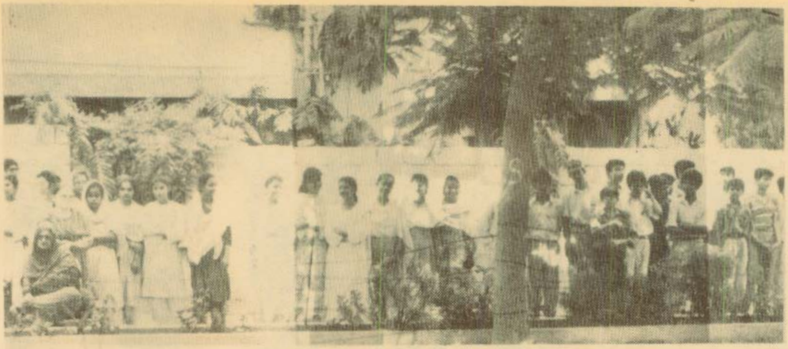

جنگ کا نظارہ کرنے والوں کا ہجوم

جس کی آنکھ نم نہ ہوئی ہوئی ہو یا جس کے جذبات میں تلاطم پیدا نہ ہوا ہو بھارتی فوجیوں کا کردار کرنے والوں نے بھی اپنے کردار سے انصاف کیا۔ خصوصاً میجر طفیل کے مقابل آنے والے بھارتی میجر دیوبر من کا رول کاشف طاہر نے بڑی خوبصورتی سے نبھایا بھارتی فوجیوں کو یہ رول کرنے کے لئے اپنے چہروں پر "چیری بلاسم" بھی لگانا پڑی۔ مرتے کیا نہ کرتے۔بے چاروں نے یہ بھی کیا۔درخت کی ٹہنی پہ بیٹھ کر جنگ لڑنے والے بچے سعد یونس نے تو کمال ہی کر دیا یہ معرکہ کوئی گھنٹہ بھر چلا ہو گا دشمن کو شکست فاش ہوئی۔لکشمی پور پر قبضہ کر لیا گیا۔دشمن کو پسپا ہونا پڑا۔ میدان جنگ دشمن کی لاشوں اور شہیدوں سے اٹ گیا۔جابجا خون بکھرا ہوا تھا پستول کے فائر اور پٹاخوں کی بو چاروں طرف پھیل گئی تھی۔یہ منظر مصنوعی سہی مگر اس کے پس منظر سے ابھرنے والی آواز نے ایک بار پھر آنکھوں کو پرنم کر دیا یہ آواز ایک پر تاثیر نغمے کی تھی

اے راہ حق کے شہیدو تمہیں ہماری وفائیں سلام کہتی ہیں

میجر طفیل زخمی ہونے کے بعد شہید ہو گئے۔شہید کی موت قوم کو حیاتِ نَو بخش گئی دشمن میجر دیوبر من سچ مچ کی جنگ میں تو گرفتار کر لیا گیا تھا مگر کراچی پبلک اسکول کے بچوں نے اسے میدان میں ہی ڈھیر کر دیا۔ٹھیک ہی کیا۔آخر دشمن کو زیادہ مہلت دینے کا فائدہ ہی کیا ہے۔جنگ میں ۳۵ بچوں نے حصہ لیا۔ مس کوثر، مس فہمیدہ، مس ممتاز اور مس فاطمہ نے ۵ روز تک اس جنگ کی تیاری کروائی۔

اس خوبصورت پروگرام کی تیاری اور اس کی بھرپور پیشکش پر اسکول کی پرنسپل شاہینہ محمود صاحبہ کو جتنی بھی مبارک باد دی جائے کم ہے اختتام پر کراچی پبلک اسکول کے جملہ برانچوں کی پرنسپل محترمہ مسز معروف نے ان بچوں کو جی بھر کر شاباش دی جن کی جبینوں پر وطن سے محبت کی افشاں چمک رہی تھی اور جن کے چہرے وطن کی محبت سے سرشار تھے۔

# میرے بابا

اوجھڑی کیمپ کے سانحے میں نہ جانے کتنے گھر اُجڑ گئے۔ یہ سچا واقعہ ان ہی گھروں میں سے ایک گھر کا ہے۔ یہ تحریر ہمیں ایک بہادر بچی نے ارسال کی ہے جس کے بابا نے دوسروں کی زندگیاں بچانے کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ اس بچی نے اپنا نام اور پتا نہیں لکھا۔ ہم اس تحریر کو جوں کا توں شائع کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی اس بہادر بچی سے اپنا مکمل نام اور پتا لکھنے کی گزارش بھی کرتے ہیں تاکہ اسے اگلے ماہ شائع کر سکیں۔

میرے والد کا نام میجر اعجاز علی شاہ تھا وہ پاک فوج میں بیس سال سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ میرے ابو، امی، میں اور میرا چھوٹا بھائی، ہم سب ایک چھوٹے سے کنبے کی صورت میں ایک

خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہمارے ابو جنہیں ہم بابا کہتے تھے ہم سے بے حد پیار کرتے تھے اور ہماری زندگی مزے میں گزر رہی تھی۔ ۱۹۸۶ء کے آخر میں ہمارا تبادلہ اسلام آباد ہوگیا جہاں میرے بابا آئی ایس آئی یعنی انٹیلجنس کے محکمے میں آگئے۔ ان کا دفتر اوجھڑی کیمپ راولپنڈی میں تھا جبکہ ہمارا فلیٹ مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں تھا۔ ہم نے ۱۹۸۷ء کا سال اچھا گزارا۔ بابا نے اس سال عمرہ بھی کیا اور کئی دوسرے ممالک بھی گئے۔ پھر ۱۹۸۸ء کا سال شروع ہوا۔ مارچ میں مَیں نے اپنا سالانہ امتحان دیا پھر ہماری چھٹیاں ہوگئیں جس کے بعد مجھے آٹھویں جماعت میں جانا تھا۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۸ء

آج میرے اسکول کا پہلا دن تھا لیکن میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لئے امی نے مجھے اسکول جانے سے روک دیا۔ اور کہا کہ "بابا آکر تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔" صبح جب میری آنکھ کھلی تھی تو میں نے اپنے بابا کی صرف آواز سنی جو اپنے آفس جارہے تھے اور میرے بھائی سے کہہ رہے تھے کہ "چلو آؤ۔"

تقریباً دس بجے میں اور میری امی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے ایک زور دار دھماکا سنا۔ بھاگ کر باہر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پنڈی کی جانب آگ اور دھویں کا ایک بہت بڑا گولہ اٹھ رہا ہے جس میں سے وقفے وقفے کے بعد چنگاریاں سی اٹھتی ہیں۔ ہم بہت گھبرائے۔ گیارہ بجے کی خبروں میں پتا چلا کہ یہ آگ اوجھڑی کیمپ کے اسلحہ ڈپو میں لگی ہے۔ "اُف میرے خدایا، یہ تو وہی جگہ ہے جہاں میرے بابا کا آفس ہے۔" میں نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میری امی نے بابا کے دفتر ٹیلی فون کیا لیکن وہاں سے جواب آیا کہ سب خیریت ہے۔ جب ہمیں کچھ تسلی ہوئی تو ہمیں اپنے بھائی کی فکر پڑی ہم اس کے اسکول گئے تو اسکول خالی پڑا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ بس بچوں کو لے کر چلی گئی ہے۔ ہم پھر دوڑے دوڑے گھر گئے۔ دیکھا تو بھائی آچکا تھا۔ اطمینان ہوا۔ ہم تینوں بابا کا انتظار کرنے لگے۔

ایک، دو، تین پورے دس گھنٹے گزر گئے لیکن بابا نہ آئے۔ امی تو ہمت ہار بیٹھیں اور ان پر نیم بے ہوشی طاری ہوگئی۔

اگلے روز میری خالہ جو اسلام آباد ہی میں رہتی تھیں آگئیں اور دوپہر کے وقت میرے ماموں بھی ہم جس سے ملتے روتے پیٹتے۔ امی اس دوران کئی دفعہ اوجھڑی کیمپ بھی گئیں لیکن وہ جب بھی آتیں ان کے چہرے پر مایوسی ہی مایوسی ہوتی۔

آہستہ آہستہ جتنے رشتہ داروں کو پتا لگا۔ سب آتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ میری دادی، دادا اور دو پھوپھیاں جو امریکہ میں تھیں وہ

بھی آگئیں۔ نہ آئے تو میرے بابا۔

۱۶ اپریل ۱۹۸۸ء

میں ان بیتے ہوئے چھ دنوں میں اتنا رو چکی تھی کہ اب اگر رونا چاہتی بھی تو آنسو نہ نکلتے۔ بابا کے انتظار میں میری آنکھیں تھک کر رہ گئی تھیں۔ ان کا کچھ پتا نہ تھا۔ امی کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جارہی تھی۔ مہمان دن رات آتے جاتے رہتے۔ آخر تنگ آکر میں اوپر چھت پر چلی گئی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میرے پھوپھا اوپر آئے اور مجھے دیکھ کر رونے لگے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور میں چیخنے لگی کہ بتائیں کیا ہوا ہے۔ پھر میری پھوپھی آئیں اور انہوں نے مجھے کہا "تمہارے بابا کی باڈی مل گئی ہے۔"

میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میں دوڑی دوڑی نیچے گئی تو وہاں قیامت برپا تھی۔ "اف اللہ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میرے بابا نے تو مجھے ہسپتال لے جانا تھا۔ وہ خود مجھ سے پہلے کیوں چلے گئے۔"

اسی دن ہم پشاور، جو ہمارا آبائی شہر ہے۔ آئے۔ اسی شام میرے بابا کو فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔

میرے بابا کی شہادت یوں ہوئی کہ جب پہلا دھماکہ ہوا تو وہ اپنے آفس میں تھے جب انہیں آواز آئی تو وہ جیپ میں بیٹھ کر اسلحہ ڈپو کی طرف روانہ ہوئے تاکہ اس کے قریب والی عمارت میں پھنسے ہوئے لوگوں کو بچا سکیں۔ جب وہ عمارت کے اندر داخل ہوئے تو دوسرا دھماکہ ہوا اور عمارت کا ایک ستون ان کے سر پر آگرا جو ان کی شہادت کا باعث بنا۔

میرے بابا آسانی سے اپنی زندگی بچا سکتے تھے لیکن ان کا دل ایک مجاہد کا دل تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اپنے لئے تو سب جیتے ہیں لیکن اصلی عظمت یہ ہے کہ دوسروں کے لئے کچھ کیا جائے۔ یوں انہوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے خدا اور اس کے رسولؐ کے سامنے اپنا اور ہمارا سر بلند کر دیا۔ ۱۹۹۰ء میں مارچ کے مہینے میں میرے بابا کو حکومت کی جانب سے ستارہ بسالت دیا گیا۔ وہ آج ہم میں نہیں لیکن اب بھی مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ اچانک کہیں سے آکر مجھے اپنی گود میں اٹھالیں گے۔

گناہوں سے سچی توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے
اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔

# میں کیوں واپس نہ آؤں گا

شاهده صدف

میں اکثر چلتے چلتے گھر کا رستہ بھول جاتا ہوں
بہت محتاط رہ کر بھی
یہ رستے مجھ سے پہچانے نہیں جاتے
مجھے ہر چوک اپنا چوک لگتا ہے
کہیں بھی اپنی بس سے کود جاتا ہوں
اگر باجی نہ ہوں تو میں یونہی اک روز کھو جاؤں بھٹک جاؤں، پلٹ کر میں نہ گھر آؤں
بڑے بھیا کو گر معلوم ہو جائے
وہ سمجھاتے ہیں کم لیکن ڈراتے مجھ کو زیادہ ہیں
خدا کے واسطے انسان بن جاؤ
اٹھا لے جائے گا تم کو کسی دن کوئی چپکے سے
تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے گا
بھکاری بن کے تم گلیوں میں در در بھیک مانگو گے
اک ابو ہیں جو روزانہ مجھے تلقین کرتے ہیں
تمہیں گھر تک کا رستہ یاد رکھنا چاہیے
بچے نہیں ہو تم
کبھی امی میرے رخسار سہلاتی ہیں، کہتی ہیں
میری جاں چاند میرے روز تو اسکول جاتے ہو
ہے اس میں بات ہی کیا بھول جانے کی؟
بھلا اسکول کا رستہ بھلا دو گے

تو کیسے علم سیکھو گے
ابھی چھوٹا ہوں مجھ سے راستے پرکھے نہیں جاتے
میری کوئی نہیں سنتا
مگر اک بات ہے جس پر میں اکثر غور کرتا ہوں
ہمارے گھر کے آنگن میں گھنا اک پیڑ ہے جس میں
پرندے چہچہاتے ہیں پرندے گھر بناتے ہیں
کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ
ننھا سا کوئی بچہ پرندوں کا
عجب بے بال و پر، بوٹی کی صورت
گھونسلے سے جھانکنے میں گر بھی جاتا ہے
کبھی اڑنے کی کوشش میں اتر آتا ہے آنگن میں
تو واپس جا نہیں سکتا
وہ شاید گھر کا رستہ بھول جاتا ہے
تو ایسے میں کبھی امی، کبھی بھیا،
اٹھا کر اس کو واپس گھونسلے کے پاس رکھتے ہیں
پرندے چہچہاتے ہیں چیختے خوشیاں مناتے ہیں
میں اک ننھا سا بچہ ہوں
بھری دنیا کی رونق میں اکیلا،
سوچتا ہوں کہ
اگر میں کھو گیا اک دن
تو کیوں واپس نہ آؤں گا
پرندے میرے ساتھی، راہبر میرے
یہاں تک لے کے آئیں گے
مجھے امی سے باجی اور بھیا سے ملائیں گے۔

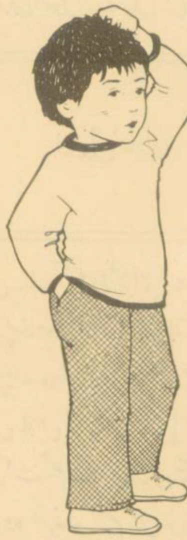

# غریب دوست وزیر اعظم

فاروق عادل

وہ واقعی منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے، لیکن جب دنیا سے کوچ کیا تو ان کے بنک اکاؤنٹ میں صرف چند روپے تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے آبا و اجداد کی دولت دونوں ہاتھوں سے لُٹا دی تھی۔ ان کی دولت لٹ گئی تھی اور قوم آزادی کی دولت سے مالا مال ہوئی تھی وہ اس ملک کے پہلے وزیر اعظم اور قائداعظم محمد علی جناح ؒ کے دست راست تھے۔

یہ کوئی پانچ صدی پہلے کا واقعہ ہے۔ ایران سے ایک معزز خاندان ہجرت کر کے ہندوستان آیا اور مشرقی پنجاب کے ایک مقام کرنال میں مقیم ہوگیا۔ اس خاندان کے پاس بے حساب زرعی اراضی تھی اور اپنے خوبصورت محلات تھے۔ ان ہی محلوں میں سے ایک محل میں یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء کو لیاقت علی پیدا ہوئے۔ جنہیں ذرا بڑا ہونے پر پورے خاندانی القاب کے ساتھ نوابزادہ خان لیاقت علی خان کے نام سے پکارا گیا۔ لیاقت علی اپنے والد رستم علی خان کے دوسرے بیٹے تھے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ننھے لیاقت علی کو ۱۹۰۹ء میں محمڈن اینگلو اورینٹیل کالجیٹ اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ جہاں انہوں نے سال میں دو دو جماعتیں پاس کیں۔ اور اکثروبیشتر اپنی جماعت کے مانیٹر رہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نوعمر لیاقت علی کو گھر سے دور رہنا پڑا۔ وہ ان دنوں ہاسٹل میں رہا کرتے تھے۔ "انگلش ہاؤس" یہ ان کے ہاسٹل کا نام تھا، جس کی کرکٹ ٹیم کے کئی برس تک وہ کپتان رہے۔ یعنی وہ صرف تعلیم میں ہی نہیں کھیل کے میدان اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی آگے آگے رہتے تھے۔ ان کی ان ہی قائدانہ

سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اس زمانے کے ایک استاد نے کہا تھا کہ "ایسا لگتا ہے کہ یہ لڑکا آگے چل کے کوئی بہت بڑا کام کرے گا"۔ لیاقت علی کے استاد نے درست بھانپا تھا۔ لیاقت علی واقعی بہت بڑے کام کیلئے خود کو تیار کر رہے تھے۔

سال میں دو دو جماعتیں پاس کرنے والے لیاقت علی نے تعلیم کے ابتدائی درجے بہت جلد مکمل کرلئے۔ اب وہ احمد آباد یونیورسٹی کے طالبعلم تھے اور اپنے تعلیمی مطالعے کے ساتھ ساتھ دین، فلسفے، ادب اور شاعری کا مطالعہ بھی کیا کرتے تھے۔ انہیں اس زمانے میں آرٹ سے بھی دلچسپی ہوگئی تھی اور موسیقی سے بھی۔

لیاقت علی بڑے خوش باش اور جملے باز قسم کے نوجوان تھے جو اپنی باتوں اور تقریروں میں غالب اور اقبال کے شعر پڑھا کرتے تھے اور دوستوں کے ساتھ بات چیت میں شاندار لطیفے بھی سنایا کرتے تھے۔ فارسی لٹریچر کا مطالعہ بھی خوب تھا۔

۱۹۱۹ء میں جب انہوں نے گریجویشن کیا تو انہیں ہندوستان کی اعلیٰ ترین ملازمت انڈین سول سروس کا امتحان دینے کی پیشکش ہوئی، جو انہوں نے مسترد کردی۔ وہ ایک اور فیصلہ کرچکے تھے، اپنی غلام قوم کی آزادی کیلئے جدوجہد کرنے کا فیصلہ۔

مگر وہ اپنے اس فیصلے پر عملدر آمد سے قبل خود کو مزید قابل اور اہل بنانا چاہتے تھے، چنانچہ وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے انگلینڈ چلے گئے۔ جہاں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے فراغت پانے کے بعد بار ایٹ لاء کیا۔

ان کی تعلیم ۱۹۲۲ء میں مکمل ہوگئی اور وہ وطن واپس لوٹ آئے اور اگلے ہی سال مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ مسلمانوں کی آزادی کیلئے کام کرنے والی مسلم لیگ کو لیاقت علی خان جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مسلمانوں کے لئے دل میں درد رکھنے والے نوجوان رہنماؤں کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں قائداعظمؒ کی دوراندیش نگاہوں نے انہیں پہچان لیا۔ اس لائق اور متحرک نوجوان کی صلاحیتوں کا اندازہ کرکے اسے اپنا سیکرٹری جنرل بنالیا۔ یہ ۱۹۳۶ء تھا۔ اور قرارداد پاکستان منظور ہونے میں ابھی چند ہی سال باقی تھے۔ ایک جونیئر کو یوں اعلیٰ مرتبہ ملنے پر بہت سے رہنما حیرت زدہ رہ گئے۔ مگر اس موقعہ پر قائداعظمؒ نے فرمایا کہ "لیاقت علی ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے گرانقدر اثاثہ ہیں۔"

نومنتخب سیکرٹری جنرل نے اپنے عظیم قائد کے الفاظ کو غور سے سنا اور ساری عمر یہ کوشش کرتا رہا کہ میں ویسا ہی بن جاؤں جیسا قائد نے میرے لئے کہا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے قائداعظمؒ سے سیکھا ہے کہ "مقصد سے عشق، دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے۔" انہوں نے عظیم قائد سے جو سبق سیکھا، زندگی بھر اس پر عمل کرتے رہے۔ ہمیں ان

کی زندگی، قائداعظم کے اس قول کی تفسیر نظر آتی ہے۔

قیامِ پاکستان سے قبل ایک عبوری حکومت قائم کی گئی تھی۔ جس میں وزارتِ خزانہ کا عہدہ مسلم لیگ کو دیا گیا۔ اصل میں یہ ہندوؤں اور انگریزوں کی ایک چال تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان چونکہ حساب کتاب میں کمزور ہوتے ہیں اس لئے مسلم لیگ اس وزارت کو نہیں چلا پائے گی اور اس طرح یہ اہم وزارت بھی کانگریس کو مل جائے گی۔ اور نام بھی ہوجائے گا کہ ہم نے تو مسلمانوں کو حکومت میں نمائندگی دی تھی مگر وہ اپنی نالائقی سے ایک وزارت بھی نہیں چلا پائے۔ ایک ملک کیسے چلائیں گے۔ مگر قائداعظمؒ نے اس اہم ذمہ داری کیلئے لیاقت علی خان کو نامزد کیا۔ لیاقت علی خان نے وزارت سنبھالتے ہی ایک ایسا شاندار بجٹ پیش کیا جس سے دشمن بھی عش عش کر اٹھے اور بدخواہ اپنے ہی وار کا شکار ہوکر رہ گئے۔ یہ بجٹ غریب آدمی کا بجٹ کہلایا۔ اس بجٹ کی تعریف کرتے ہوئے ہندوستان کے ایک معروف انگریزی اخبار "اسٹیٹسمین" نے لکھا تھا کہ اس سے زیادہ اچھا بجٹ پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوا تو قائداعظم نے لیاقت علی خان کو وزیراعظم نامزد کیا۔ ۱۹۴۸ء میں قائداعظم اللہ کو پیارے ہوگئے تو ملک کی قیادت کی تمام ذمہ داریاں ان ہی کے کاندھوں پر آگئیں اور آپ نے ان کی انجام دہی میں دن رات ایک کر دیا۔ اس سلسلہ میں ۱۹۵۰ء کا لیاقت نہرو معاہدہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے جس میں انہوں نے اقلیتوں کے حقوق کا ذکر کرکے بھارت کے انتہاپسند ہندوؤں کے ہاتھ قانونی طور پر باندھ دیئے۔ یہ معاہدہ آج بھی پاک بھارت تعلقات کی بنیاد ہے۔

ملک وملت کیلئے دن رات ایک کردینے والا یہ قائد ایک رات سردی سے ٹھٹھر رہا تھا کہ ان کے ایک دوست اور تحریک پاکستان کے کارکن یوسف ہارون نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ کوئی اور گرم چیز منگوا لیجئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ "یوسف! میں ٹھیک ہوں، فکر تو ان لوگوں کی کرنی چاہئے کہ جو چھت سے بھی محروم ہیں۔ میرے پاس اللہ کے فضل سے سر چھپانے کیلئے چھت تو موجود ہے۔

یوسف ہارون بتاتے ہیں کہ وزیراعظم لیاقت علی خان بہت خوش لباس انسان تھے۔ ان کے سوٹ بہت نفیس ہوتے تھے، مگر بہت کم ہوتے تھے۔ وہ فضول خرچی کے قائل ہرگز نہ تھے، میں تین چار سال تک دیکھتا رہا ان کے پاس وہی سوٹ ہے۔ وہ اکثر پرانے سوٹوں کی مرمت کرالیا کرتے تھے۔

وہ بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ان کے گھر گیا، پاکستان کے وزیراعظم نے ایک ایسی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے۔ میں نے اس جانب ان کی توجہ دلائی تو کہنے لگے کہ

پاکستان ایک غریب ملک ہے اور مجھے اس کے مطابق ہی اخراجات کرنے چاہئیں۔

پاکستان کا وزیراعظم جو ہندوستان سے ہجرت کرتے وقت وہاں اربوں روپے کی جائیداد چھوڑ آیا تھا، اس نے اپنے نئے وطن آکر اس لئے کوئی کلیم داخل کرنا پسند نہ کیا تھا کہ مبادا کوئی عام پاکستانی اپنا حق وصول کرنے سے محروم رہ جائے اور میں کچھ حاصل کرلوں۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک آخری مسلمان بھی اپنا حق وصول نہیں کرلیتا، وہ اپنا حصہ وصول نہیں کریں گے۔ چنانچہ وہ اپنا گزر بسر حکومت پاکستان سے ملنے والی تنخواہ میں کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں شہید کیا گیا تو ان کا کل اثاثہ محض چند روپے تھے۔

پاکستان کا وزیراعظم ہونے کے باوجود ان کا ہاتھ اتنا تنگ رہا کرتا تھا کہ انہوں نے اپنے بچوں کو عام پاکستانیوں کے ساتھ عام سے اسکولوں میں داخل کرادیا۔ حالانکہ وہ چاہتے تو وہ اپنا اثرورسوخ استعمال کرکے بہت کچھ کرسکتے تھے۔

یوسف ہارون بتاتے ہیں کہ جب میں سندھ کا وزیراعلیٰ بنا تو مجھے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "تمہارے پاس ہر قسم کے لوگ مدد حاصل کرنے کیلئے آئیں گے لیکن تم صرف اس کی مدد کرنا جس کا حق ہو۔ ورنہ قیامت کے دن حقدار کے احتساب سے نہیں بچ سکو گے۔"

انہوں نے پاکستان کے ایک نامزد سفیر کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "لوگ سمجھتے ہیں کہ سفارت بہت آسان کام ہے۔ مگر پاکستان کے سفیر کیلئے ایسا نہیں ہے۔ ہمارے دین نے خاص ذمہ داریاں ہمارے کاندھوں پر ڈالی ہیں چونکہ ہمیں ایک عظیم مقصد کیلئے کام کرنا ہے اس لئے تم ایمانداری اور محنت سے کام کرنا تاکہ پاکستان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔"

ایک دفعہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ جمعہ کی نماز مختلف مساجد میں ادا کیا کریں گے تاکہ عوام سے رابطہ رہ سکے۔ ایک دفعہ کیماڑی کی جامع مسجد میں پہنچے تو آخری صف میں جگہ ملی۔ لوگوں نے پہچان کر آپ کو اگلی صف تک پہنچانے کیلئے راستہ بنایا تو آپ نے انکار کردیا۔ اور فرمایا کہ "یہ اللہ کا گھر ہے یہاں جو پہلے آیا ہے اسی کا پہلی صف میں کھڑا ہونے کا حق ہے۔"

اسی طرح ایک مسجد میں ایک غریب آدمی ان کے ساتھ کھڑا نماز پڑھ رہا تھا اور بار بار اس کا جسم وزیراعظم کے جسم سے مس ہورہا تھا۔ وزیراعظم کے عملہ نے سمجھا کہ یہ کوئی گداگر ہے اس لئے اس کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی جس پر وہ ناراض ہوگئے اور فرمایا "اللہ کے گھر میں وزیر اور حقیر سب برابر ہیں۔"

# مُستقبل کا شاعر

شاہ نواز فاروقی

ایک دن طارق میاں نے ضد یہ کی
سیر کو جنگل میں جانا ہے ابھی
ہم نے سمجھایا کہ جنگل دور ہے
پھر یہ ہے کہ اس میں اک لنگور ہے
بُو ہماری سونگھ کر وہ آئے گا
اور ہم کو مار کر کھا جائے گا
تھام کر وہ ہاتھ بولے "آیئے"
اچھے چاچا ہم کو مت ٹرخایئے
ہم نے ٹافی کا انہیں لالچ دیا
ننّھے طارق ہنس کر بولے شکریہ
خیر ! جنگل میں ہمیں جانا پڑا
ان کے ننّھے دل کو بہلانا پڑا
دندنائے خوب وہ جنگل کے بیچ
ایسے جیسے پہلواں دنگل کے بیچ
آم توڑے اور توڑے چند پھُول
ایسے جیسے توڑتے ہیں ہم اُصول

تتلیوں پر تبصرے کرتے رہے
جھینگروں کے شور سے ڈرتے رہے
درمیاں جنگل کے تھا اک آبشار
تھی فضا جس سے وہاں کی خوشگوار
اس کو بے حد شوق سے تکتے ہوئے
ننھے طارق چلتے چلتے رک گئے
چیخ کر بولے وہ پھر آنکھوں کو پھاڑ
رو رہا ہے دیکھئے چاچا پہاڑ
سن کے یہ دل نے ہمارے رائے دی
یہ بڑا ہو کر کرے گا شاعری

# ملائیشیا کے محنت کش بندر

اسامہ بن سلیم

ایک زمانے تک انسان بندر کو سدھا کر صرف کھیل تماشے دکھاتا رہا مگر پھر جب "بندر" حیوانی رویّوں پر مطالعہ کرنے والے ماہرین کے ہاتھ لگا تو انہوں نے اسے کھیل تماشے سے زیادہ اہم جانا اور اسے اہم انسانی ضرورتوں کے لئے استعمال کیا۔ آنکھ مچولی کے گزشتہ شماروں میں ہم آپ کو بندر چمپنزی یا گوریلوں سے متعلق بہت سے مضامین میں کافی کچھ بتا چکے ہیں۔ "زینی ریسٹورنٹ" کے نام سے "حیرت ناک نمبر" میں شائع ہونے والے مضمون میں ہم نے بتایا تھا کہ کس طرح چمپنزیوں کا پورا ایک گروہ ایک ریسٹورنٹ کو کامیابی سے چلا رہا ہے۔

یہاں ہم اپنے بندر دوست ساتھیوں کے لئے ایک اور دلچسپ رپورٹ شائع کر رہے ہیں جو ملائیشیا کے بندروں سے متعلق ہے۔ ملائیشیا کے مشرقی علاقے میں واقع ایک قصبے "بیلا داؤ" کے یہ بندر اپنے محنت کش کسان مالکان کے ساتھ ہر صبح ناریل کے باغ میں جاتے ہیں اور صبح سے شام تک ناریل توڑ کر نہ صرف ان کی مدد کرتے ہیں بلکہ اپنا رزق بھی حلال کرتے ہیں۔ (حالانکہ حلال حرام کی تمیز بندروں کے لئے نہیں ہوتی) ابتداء میں یہ کام مقامی لوگ کیا کرتے تھے مگر پھر ہوا یوں کہ ۳۰ سے ۴۰ فٹ اونچے ناریل کے درختوں سے ناریل توڑنے کے سخت اور دشوار کام سے لوگ بیزار ہوتے گئے۔ اس بیزاری کی کئی وجوہات تھیں مثلاً یہ کہ درختوں پر خطرناک چیونٹے آجاتے، شہد کی مکھیاں محنت کشوں کو کاٹ لیتیں یا پھر ناریل کے بلند درختوں پر زہریلے ناگ انسانوں کے لئے خطرہ بن جاتے۔ ایسے میں ناریل توڑنے کے لئے بندروں کو سدھانے کا خیال وہاں کے مسلمان کسانوں کے ذہن میں آیا۔ بندر اس مقصد کے لئے نہ صرف مددگار ثابت ہوا بلکہ انسان سے زیادہ تیز رفتار بھی۔

ریڈرز ڈائجسٹ کے مضمون نگار رینڈل پیفر کو وہاں کے مسلمان کسان طاہر نے بتایا کہ وہ لوگ ۲۰ دن میں بندر کو سدھا لیتے ہیں اور بندر نہ صرف ناریل توڑتا ہے بلکہ بوریوں میں بھرنے، اٹھانے اور لانے لیجانے میں بھی ان کی مدد کرتا ہے۔ وہاں کے لوگ بندروں کو اپنے فیملی ممبرز کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ ہر بندر ۳۰۰ سے ۴۰۰ ناریل روزانہ توڑ لیتا ہے جب کہ یہ علاقہ ایک سال میں ۱۲۵ ملین ناریل کی پیداواری صلاحیت رکھتا ہے۔

اندازہ کیجئے کہ بندروں نے باغبانی کا کتنا بڑا انتظام خود سنبھالا ہوا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پاکستان کی صورت میں جو باغ عطا کیا ہے ہم اسے سنبھالنے اور سنوارنے کی اتنی صلاحیت بھی نہیں رکھتے جتنی کہ ملائشیاء میں ایک عام بندر رکھتا ہے۔

# ناریل کے دھندے میں بندروں کے کیا کہنے

مالک کے اشارے پر بندر ناریل توڑنے جارہا ہے

سائیکل پہ بیٹھ کے ہم جارہے ہیں باغ میں
باغ میں ہیں ناریل اور ناریل توڑیں گے ہم

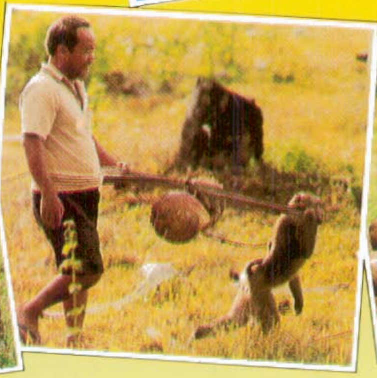

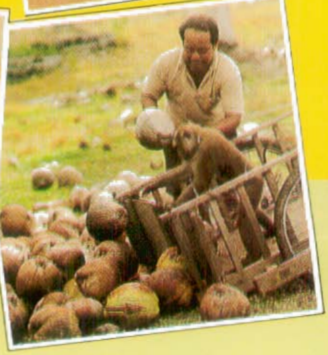

## بندروں کا بہتر استعمال یا محض استحصال

ملائیشیا کے ایک باغ میں سدھائے ہوئے بندر نہ صرف ناریل توڑتے ہیں بلکہ آخری لمحے تک کام کرتے ہیں

# جاپانی بچّے کتنے اچھے

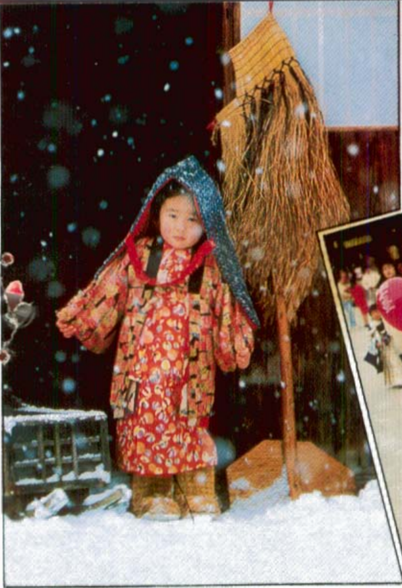

برفباری اور پیاری سی بچّی

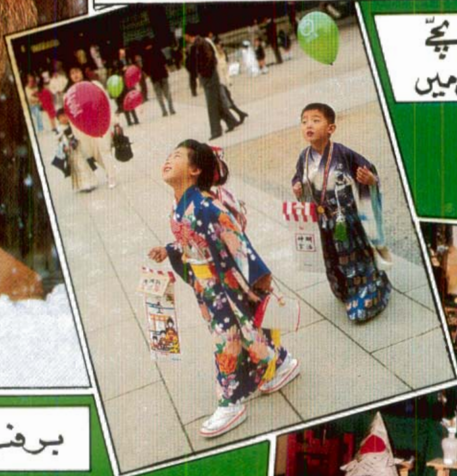

جاپانی بچّے
روایتی لباس میں

ہم آپ کو کیسے
لگ رہے ہیں

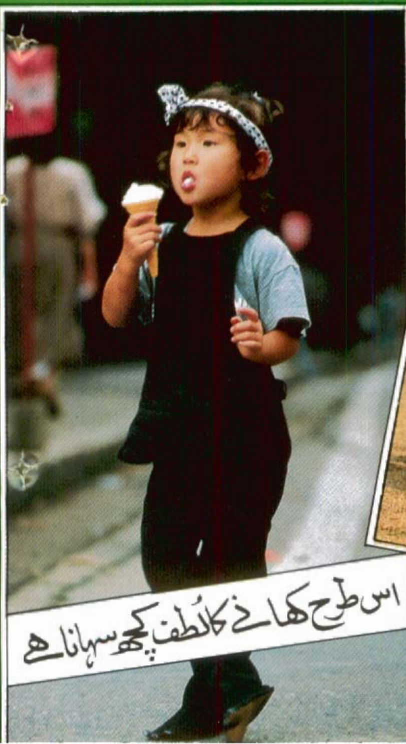

اس طرح کھانے کا لُطف کچھ سہانا ہے

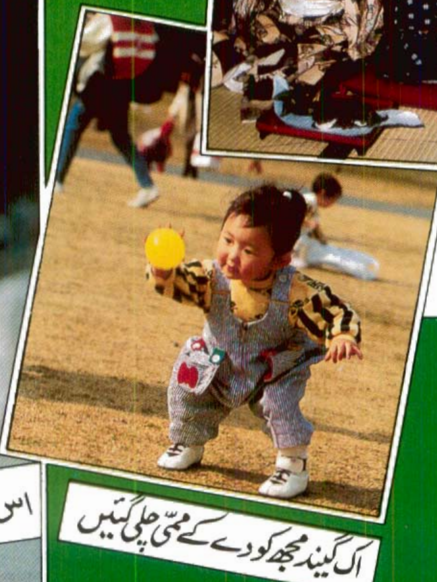

اک گیند مجھ کو دے کے ممّی چلی گئیں

# بیدار قوم ہونہار بچے

سلیم مغل

پہلا حصہ

دنیا میں کوئی چیز بے بنیاد نہیں ہوتی۔ جس طرح فلسفے کی بنیاد فکر ہے، اور علم کی بنیاد مطالعہ، جس طرح ایجاد کی بنیاد نظریہ ہے۔ اور تخلیق کی بنیاد خیال، بالکل اسی طرح قوموں کی بنیاد اس کے "بچے" ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنا "آج" انہی بچوں سے تو مستعار لیا ہوا ہے اور انہی کو لوٹانا ہے۔ جو قومیں یہ بات جانتی ہیں۔ ان کا "کل" روشن ہے اور جو جانتے ہوئے بھی بے بہرہ ہیں ان کا کل تو کل آج بھی محفوظ نہیں۔

وہ عمارت مضبوط ہوتی ہے جس کی بنیادیں گہری ہوں۔ اس درخت کو طوفان نہیں گرا سکتا جس کی جڑیں گہرائی تک اتر چکی ہوں۔ کھوکھلی دیوار ہوا کے جھونکے سے زمین پر آ رہتی ہے۔ کاغذ کی ناؤ زیادہ دیر تک نہیں تیر سکتی۔

دنیا کی وہ قومیں جنہوں نے بچوں کی اہمیت کو سمجھا انہوں نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے بچوں کی دی۔ ان کی تدریس، تعلیم اور تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ

جاپان کو حسین سے حسین تر بنانے کا عملی عہد

رکھی۔ سرکاری سطح سے لے کر نجی سطح تک ہر جگہ بچوں کو اہمیت دی۔ ان کے مسائل کو اہم جانا، ان کے معاملات کو ترجیح دی۔ قومی منصوبہ بندی میں بچوں کو سرفہرست رکھا۔ ذاتی سطح پر بچوں سے شفقت اور محبت کے رشتے استوار کئے۔ نتیجتاً جب کامل توجہ پانے والی نسل جوان ہوئی تو اس نے اپنے ملک کو مضبوط اور خوشحال بنایا۔ مقابلے کے ہر میدان میں سب کو پیچھے چھوڑ کر اپنی قوم کو سرخرو کردیا۔

جاپان ایسے ممالک میں سرفہرست ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں پارہ پارہ ہو جانے والا جاپان اور ایٹم بم کے زخموں سے چُور چُور ہو جانے والا جاپان آج اتنی بڑی طاقت بن کر ابھرا ہے کہ دیگر اقوام عالم اس کی کامیابیوں پر ششدر اور حیران ہیں۔ زیر نظر مضمون میں ہم جاپانی بچوں کے طریقۂ تعلیم، بچوں سے ان کے اساتذہ اور والدین کا تعلق اور عمومی زندگی میں بچوں کے حوالے سے مختلف نوعیت کی معلومات آپ کے مطالعے کے لئے نکات کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ معلوماتی Tips ایک زندہ و بیدار قوم کی کامیابیوں کے اسباب کو آپ پر عیاں کرنے کا باعث بنیں گے۔

جاپانی بچوں یا جاپانی قوم کی طرف سے جاپانی بچوں کے لئے دیکھے گئے خواب کے بارے میں کچھ جاننے سے پہلے یہ بھی جان لیجئے کہ جاپان مشرقی ایشیا کا ترقی یافتہ ملک ہے جو لاتعداد جزائر پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کی کرنسی "ین" کہلاتی ہے، دارالخلافہ ٹوکیو ہے۔ سائنس ٹیکنالوجی اور تجارت کے حوالے سے جاپان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جو دنیا بھر میں اپنا تسلط قائم کر چکے ہیں۔مشرق سے جب سورج ابھرتا ہے تو اس کی کرنیں جس پہلے ایشیائی ملک پر پڑتی ہیں وہ جاپان ہے۔

اہل جاپان شنتو اور بدھ مت مذاہب کے پیروکار ہیں۔مذہب کے معاملے میں جاپانی انتہاپسند نہیں ہوتے۔ اکثر جاپانی دونوں مذاہب کی پیروی کرتے ہیں۔ مثلاً اگر نئے سال کو خوش آمدید ایک عقیدے کے مطابق کرتے ہیں تو سال کو الوداع دوسرے عقیدے کے مطابق۔ مذہب محض ان کے کلچر کا حصہ بن کر رہ گیا ہے ورنہ اجتماعی طور پر جاپانی سیکیولرازم (لادینیت) سے قریب تر ہیں۔ دوسرے کا دل نہ دکھانا، دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنا ہر جاپانی اپنا فرض سمجھتا ہے۔

جاپانی اللہ کی ذات کا وہ تصور تو نہیں رکھتے جو ہم مسلمان رکھتے ہیں البتہ ایک "بڑی قوت" کی موجودگی کو اپنے مخصوص تصوّرات کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ اس اَن دیکھی قوت کو نیچر (فطرت) کہہ دیتے ہیں۔ جاپانی کہانیوں، فلموں اور ڈراموں وغیرہ میں ان کے دیوتاؤں اور ماورائی مخلوق کے قصے جابجانظر آتے ہیں۔ جاپانیوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی واحد قوم ہے جس نے اپنی قدیم روایتوں اور رسوم ورواج کو جدید دور کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ ان کی زندگی جدید و قدیم کا ایک حسین پیکر بن گئی ہے۔

دنیا بھر میں اوسط عمریں بھی سب سے زیادہ

جاپانیوں کی ہوتی ہیں۔ عورتوں میں ۸۵ سال اور مردوں میں اوسط عمر ۸۰ سال تک ہے۔ دل کی بیماریاں اور کینسر جیسے امراض بھی دنیا میں سب سے کم جاپان میں ہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید ان کی غذاؤں میں سادگی اور توازن کا عنصر بھی ہے۔

جاپانیوں کے بارے میں مختصراً کچھ جاننے کے بعد آیئے ان کے اسکولوں کا رخ کرتے ہیں جہاں اَن گنت پیارے پیارے بچے اپنی آنکھوں میں مستقبل کے سنہرے خواب سجائے حصُولِ علم کا زینہ چڑھ رہے ہیں۔

## جاپانی اسکول

○ ...... دیکھئے یہ خوبصورت سی عمارت، باغیچہ، سوئمنگ پول اور کھیل کا جو میدان ہے، یہ سب کچھ ایک ہی اسکول کا حصہ ہیں۔ اور یہ ایک اسکول ہی کیوں؟ جاپان کا ہر اسکول اپنے طرز تعمیر کے حوالے سے مکمل اسکول ہے۔ یہ اسکول اپنا علیحدہ میدان، پارک اور سوئمنگ پول رکھتا ہے۔ جاپان میں کوئی ایسا اسکول نظر نہیں آتا جسے کرائے کے تنگ و تاریک بنگلے میں بنایا گیا ہو۔

○ ...... ابھی سورج نے اپنا پورا مکھڑا ابھی نہیں دکھایا کہ چھوٹے بڑے سبھی جاپانی بچے اپنی سائیکلوں پر بیٹھ کر اسکول کی طرف جانے کی تیاری کرنے لگے۔

جن بچوں کے اسکول کچھ دور تھے انہوں نے اپنی سائیکلیں اسٹیشن کے باہر اسٹینڈ پر کھڑی کیں اور ٹرین میں بیٹھ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے۔ ٹرین کو بھی تو دیکھیں ذرا ذرا سی دیر میں آجاتی ہے۔ بہت چھوٹے بچوں کو اسکول چھوڑنے کے لئے ان کی مائیں سائیکلوں پر بٹھا کر لا رہی ہیں، ہرماں کی سائیکل کے آگے ایک چھوٹی سی سیٹ لگی ہوئی ہے۔ کیا ان ماؤں کے پاس بڑی بڑی کاریں نہیں ہیں؟ آخر بچوں کو سائیکل پر کیوں لادے پھرتی ہیں؟ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ اسکول میں بڑی بڑی نجی کاروں کی آمد کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اسکول والے چاہتے ہیں کہ بچے پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کریں اور خوامخواہ اپنی جھوٹی شان کی خاطر شونہ مارتے پھریں۔ اور پھر ابھی سے ایسا نہیں کریں گے تو بچے سادگی اور انکساری کیسے سیکھیں گے۔

اسکول جانے والے بچوں کے سینوں پر ایک بیج آویزاں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ "یہ بچہ اسکول جارہا ہے یا اسکول سے آرہا ہے" سڑک پر چلنے والا ٹریفک اس بچے کا خیال رکھے۔ اور واقعی ہر گاڑی رک کر پہلے اسے گزرنے دیتی ہے۔ اسے دیکھ کر لوگ اپنی گاڑی آہستہ کر لیتے ہیں، جیسے وہ بچہ بچہ نہ ہو نواب صاحب ہو۔

○ ...... ارے یہ کیا!! یہ تو سرکاری اسکول ہے مگر یہ تو بہت اچھا معلوم ہو رہا ہے، پرائیویٹ اسکولوں سے بھی اچھا...... حیرت کی بات ہے اس پر تو پیلا رنگ ہونا چاہئے تھا۔ عمارت بے رونق کمرے ٹوٹے پھوٹے ہونے چاہئیں تھے مگر...... جاپان کے اسکول نجی ہوں یا سرکاری سب ایک سے ایک ہیں

اور سب اچھے ہیں۔ ان میں واضح فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

○ ...... جاپان میں طریقۂ تعلیم ایک سا ہے، ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک سا نصاب پڑھایا جارہا ہے۔ ایک سے آداب سکھائے جارہے ہیں۔ یہ ساری تعلیم جاپانی زبان میں دی جارہی ہے۔ انگریزی علیحدہ سے ایک مضمون کے طور سے پڑھائی جاتی ہے مگر انگریزی کا بھوت اس طرح سوار نہیں رہتا جیسا کہ ہم پر رہتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ لوگ انگریزی میڈیم نہیں ہیں مگر پھر بھی دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ دنیا پر چھا رہے ہیں۔ کوئی بتائے گا ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

○ ...... جاپانی طرز تعلیم زبانی (oral) سے زیادہ تحریری ہے۔ بچے گفتگو کے ذریعہ کم اور تحریر و مطالعہ کے ذریعہ زیادہ سیکھتے ہیں۔ شائد اسی لئے کچھ کم گو اور شرمیلے رہ جاتے ہیں۔

○ ...... اسکولوں میں بچے نصاب سے ہٹ کر آداب اور اخلاق بھی سیکھتے ہیں۔ بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ (۱) صاف رہنا اور صفائی کرنا کتنا اہم ہے۔ (۲) کھانا کس طرح پیش کیا جائے اور (۳) کھانا مل جل کر کس طرح کھایا جائے۔؟ کھانا شروع کرنے سے پہلے بچوں نے دعا کی "ہاداکی مس" Hadaki muss یعنی "نعمتیں عطا کردہ ہیں (اللہ کی)"۔ کھانا کھا چکے تو سب نے مل کر کہا۔ "بوشوسو سامادشتا" Boshoso sama dishta یعنی "بہت اچھا کھانا، شکر ہے"۔ بچوں نے مل جل کر اسکول کو صاف کیا، اسے اچھا رکھا نہ کسی کی اماں کو برا لگا نہ کسی کے ابا کو۔

○ ...... اسکولوں میں نصاب تو پڑھایا جاتا ہی ہے مگر اس سے ہٹ کر فطرت سے پیار کرنا بھی سکھایا جاتا ہے۔

بچوں نے، کیکڑے، مچھلیاں اور کچھوے پال رکھے ہیں مگر مجال ہے جو کوئی انہیں ستائے۔ بچے جانور پال رہے ہیں پیڑ پودے لگا رہے ہیں۔ اتنا کچھ کرنے پر بھی تشفی نہ ہوئی تو سب بچے اپنی ٹیچر کے ساتھ مل کر جنگل چلے گئے۔ ٹیچر بتا رہی ہے کہ "یہ درخت ہمارے لئے خزانہ ہیں اور یہ چرند پرند ہماری دولت، انہیں ضائع نہ کیا جائے ان سے محبت کی جائے۔"

جنہوں نے فطرت سے پیار کیا۔ فطرت نے انہیں مالا مال کر دیا۔ گرمیوں میں ان ننھے ننھے کیڑوں کو پکڑنے کا مشغلہ عام ہے جنہیں Seimi کہا جاتا ہے یہ کیڑے جھینگر کی طرح شور کر کر کے آسمان کو سر پر اٹھائے رہتے ہیں۔

○ ...... اسکول میں بچوں کو زلزلے کی صورت حال میں بچاؤ کی تربیت لازماً دی جاتی ہے اس لئے کہ جاپان میں زلزلے بہت آتے ہیں۔ زلزلے تو ہمارے ہاں بھی آتے ہیں مگر اس زلزلے سے زمین کے بجائے روح کانپ جاتی ہے۔

○ ...... دو سال کی عمر ہی سے "سوئمنگ" یعنی "تیراکی" کی تربیت شروع کر دی جاتی ہے۔ اس

کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کم و بیش ہر جاپانی بچہ یا بڑا اچھی طرح تیرنا جانتا ہے۔ مان لیجئے کہ ۳ سالہ جاپانی بچہ خوب مزے سے تیر سکتا ہے۔

○ ...... آرٹ موسیقی اور کھیل اسکول کے نصاب کا لازمی حصہ ہیں بچے ان تینوں کے دلدادہ ہیں اور اکثر بچے اسکول کے علاوہ بھی، آرٹ یا موسیقی سیکھنے کے لئے کہیں نہ کہیں جاتے ہیں۔

○ ...... اسکول میں دیئے جانے والے کھانے کے وقفے میں ہر بچے کے لئے دودھ پینا لازم ہے۔ دودھ کو لازم کرنے کی دو وجوہات ہیں۔ نمبر ۱ دودھ مکمل اور متوازن غذا ہے۔ نمبر ۲، جاپان پر گرائے جانے والے ایٹم بم کے مضر اثرات آج تک باقی ہیں۔ دودھ ان اثرات کو کم کرنے کے لئے مفید ہے۔

○ ...... بچے اسکول میں "الیکشن الیکشن" بھی کھیلتے ہیں بچے خود ہی پینل بھی بناتے ہیں اور خود ہی الیکشن کمیشن بھی۔ انتخابی نتائج میں کوئی دھاندلی نہیں ہوتی چھوٹی موٹی شکایت پر بچوں کا اپنا الیکشن کمیشن خود ہی فیصلے کر لیتا ہے۔

○ ...... بچے تہوار کی تیاریاں خوب زور و شور سے کرتے ہیں۔ اساتذہ ضرورت پڑنے پر مدد تو کرتے ہیں لیکن اصل کام بچے خود ہی کرتے ہیں۔ بچے جن تہواروں میں خوب حصہ لیتے ہیں ان میں یکم جنوری کو نئے سال کا تہوار، ۳ مارچ کو بچوں کا تہوار، ۵ مئی کو لڑکوں کا میلہ، ۷ جولائی کو اسٹار فیسٹیول اور ۱۵ نومبر کو شی چی گوسان کے تہوار شامل ہیں۔ شی چی گوسان کے تہوار میں ماں باپ بچوں کو حسین کپڑے پہنا کر زیارت گاہوں پر جاتے ہیں اور بچوں کی صحت و تندرستی اور ان کی پُرمسرت زندگی کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ جاپانی تہوار منانے کے طریقے علیحدہ سے ایک مفصل مضمون کا تقاضہ کرتے ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل ممکن نہیں لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت تو ہوگی کہ جاپان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں بچوں کے تہوار پر قومی تعطیل ہوتی ہے۔

بچوں کے دن کو اتنی اہمیت وہی قومیں دے سکتی ہیں جو بچوں کی اہمیت سے آگاہ بھی ہوں۔

○ ...... ہر ماہ کے اختتام پر اسکول میں بچوں کی اجتماعی سالگرہ ہوتی ہے۔ یعنی جو بچے اس ماہ میں پیدا ہوئے ہوں وہ مل جل کر ایک ہی دن اجتماعی خوشیوں کا اہتمام کر لیتے ہیں۔

○ ...... بچوں سے اساتذہ کا تعلق بہت دوستانہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ تعلق گرمیوں کی طویل چھٹیوں میں بھی ختم نہیں ہوتا۔ بچے اور استاد ایک دوسرے کو خط لکھتے ہیں۔ فون پر رابطہ کرتے ہیں، تحائف بھجواتے ہیں اور ملنے جلنے کے مواقع نکالتے رہتے ہیں۔

اسکول کے دنوں میں بھی استاد اور بچے خوشگوار ماحول میں اچھے دوستوں کی طرح ساتھ رہتے اور پڑھتے پڑھاتے ہیں۔

○ ...... جاپان میں نظام تعلیم اتنا اچھا ہے کہ اسکول میں پڑھا ہوا نصاب بچے کے لئے کافی ثابت ہوتا

ہے۔ انہیں کسی ٹیوشن سینٹر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی البتہ بعض بچے جو ذہنی طور پر کمزور ہوتے ہیں۔مائیں گھر پہ ان کی مدد کرتی ہیں۔

○ ...... چونکہ جاپان کے تعلیمی میدان میں سخت مقابلے کی کیفیت ہے اس لئے ہر بچہ اچھے نتائج کی خاطر بہتر سے بہتر اسکول میں داخلہ لینا چاہتا ہے۔ خوب محنت بھی کرتا ہے مگر پھر بھی ذہنی طور پر کمزور بعض بچے پڑھنے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ پیچھے رہ جانے والے یا تو بہت زیادہ محنت کرتے ہیں یا پھر کوشش کے باوجود بھی آگے جاکر اپنے مطلوبہ تعلیمی اداروں میں داخلہ نہیں لے پاتے۔ داخلوں سے محروم رہ جانے والے بچے، حساس ہونے کے باعث نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں ان میں سے بعض خودکشی بھی کر لیتے ہیں جب کہ کچھ نشے کی لت میں پڑ جاتے ہیں،لیکن ایسی مثالیں بہت کم، بہت ہی کم نظر آتی ہیں۔

○ ...... جاپانی بچوں کو اچھی جامعات میں داخلہ لینے کے لئے بچپن ہی سے بہتر منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے یعنی وہ کس اسکول میں پڑھیں کہ ان کا داخلہ ان کے مطلوبہ ہایئر سکینڈری میں ہو جائے ایسا ہایئر سکینڈری جس سے پڑھنے والے مطلوبہ یونیورسٹی میں بھی داخلہ لے سکیں ۔ گویا مونٹیسوری میں داخلہ لیتے ہوئے یونیورسٹی کی منزل کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے۔

جاپان میں اعلیٰ تعلیمی ادارے زیادہ تر نجی ملکیت یا پرائیوٹ سیکٹر میں ہیں۔

○ ...... جاپان میں کالج کا تصور کم کم ہی ہے۔ زیادہ تر لوئر سکینڈری اور ہایئر سکینڈری اسکول ہوتے ہیں۔ ہایئر سکینڈری کے بعد براہ راست یونیورسٹی میں داخلہ ملتا ہے۔

○ ...... جاپان میں شہر اور دیہات کے اسکولوں میں سہولتوں کے حوالے سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر کچھ فرق ہے تو وہ محض شہر کی تیز زندگی اور گاؤں کی ٹھہری ہوئی زندگی کا۔ مگر تیز تر ذرائع ابلاغ کی وجہ سے جاپانی گاؤں اب شہروں کے مقابلے میں بہت زیادہ سست رو بھی نہیں۔

○ ...... جاپانی بچے قاعدے اور قرینے کا بڑا خیال رکھتے ہیں اسکول سے آکر اپنا بستہ، جوتے اور سامان سلیقے سے ان کی جگہ پر رکھتے ہیں۔ کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھوتے ہیں اور ترتیب سے کام مکمل کرتے ہیں۔

○ ...... پڑوسیوں کا خیال رکھنا، میوزک زور سے نہ بجانا، بڑوں سے ادب اور تمیز کے ساتھ ملنا، اونچی آواز سے قہقہہ لگانے سے گریز کرنا، ہنستے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ لینا یہ سب کچھ جاپانی بچوں نے اس طرح سیکھ رکھا ہے کہ بھولے سے بھی وہ آداب شکنی کے مرتکب نہیں ہوتے۔

مضمون کا دوسرا دور

آخری حصہ آئندہ ماہ پڑھیے!

# زندگی اے زندگی

راوی: عامر چشتی تحریر: منیر احمد راشد

کراچی چلنے کی بات ہوئی تو سبھی تیار ہو گئے۔ کاشف، عاصم، حتیٰ کہ ننھا صائم بھی۔ مگر ابّو نے سمجھایا کہ ابھی سب کا جانا مناسب نہیں ہے۔ ایک ذرا سا ٹیسٹ ہی تو ہے بس عامر چلا جائے گا۔

امی جان کے گردے میں تکلیف تھی۔ حیدر آباد میں ان کا کافی علاج کر چکے تھے، آجکل کراچی میں علاج چل رہا تھا۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی چند ٹیسٹ کروا کر ہم لوگ کراچی سے واپس آئے تھے اور اب دوبارہ جانا تھا۔ ابّو پاکستان ایگرو کیمیکل میں ایریا منیجر ہیں اور ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ میں نے ایم۔ اے اکنامکس پارٹ۔ ون کا امتحان دے دیا تھا اور آج کل فارغ تھا اس لئے امی جان کو کراچی لے جانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔

یہ ۲۶ اگست ۱۹۹۰ء کی دوپہر کا ذکر ہے جب ہم لوگ مکمل تیاری کے بعد اپنی کار میں حیدر آباد سے کراچی کیلئے روانہ ہوئے۔ ڈرائیونگ میں خود کر رہا تھا۔ میرے برابر میں میرے کزن ڈاکٹر نصرت بیٹھے تھے اور ان کے برابر میں دروازے کے ساتھ ڈاکٹر آفتاب تھے۔ جبکہ پچھلی نشست پر بائیں طرف چھوٹا بھائی عاصم، درمیان میں امی اور پھر دادی جان بیٹھی تھیں۔ بڑے اچھے ماحول میں باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ سپرہائی وے پر مناسب رفتار سے چلے جا رہے تھے۔ سورج مغرب میں جھک گیا تھا۔ چیزوں کے

سائے لمبے ہونے لگے اور ہماری منزل قریب آگئی تھی۔ شام کے ساڑھے چھ بجے ہم کراچی ٹول ٹیکس کے قریب پہنچے تھے کہ امی جان نے پانی مانگا۔ گردے کے درد کی وجہ سے انہیں بار بار پانی کی ضرورت پڑتی تھی، اس لئے ہم نے ایک کولر ساتھ رکھ لیا تھا۔ ڈاکٹر نصرت نے گلاس دادی جان کے ہاتھ میں پکڑایا اور کولر اٹھا کر پانی ڈالنے کیلئے پیچھے کی جانب گھومے ہی تھے کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور سارا منظر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ڈیڑھ ہفتے کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں آغا خان ہسپتال میں تھا۔ بعد میں حادثے کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ وہ ایک افغانی ٹرالر تھا جو اچانک سامنے سے غلط سائیڈ پر آگیا اور حادثہ ہوا۔ ڈرائیور موقع سے فرار ہوگیا تھا لیکن بعد میں پکڑا گیا اور ابّو نے اسے معاف کر دیا۔

کار میں سوار سبھی لوگ زخمی ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نصرت کا ایک بازو کٹ کر الگ ہوگیا اور صرف کھال کے ایک باریک تسمے کے ذریعے جسم سے لٹکتا رہا۔ اسے بعد میں اے او کلینک میں ڈاکٹر شاہ نے بڑی مہارت سے جوڑا اور اس واقعہ کی خاصی شہرت ہوئی۔ ان کی ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی جس میں راڈ ڈالا گیا۔ ڈاکٹر آفتاب کا سر پیچھے سے شدید زخمی ہوا۔ دادی جان اور امی جان کے بھی سر میں سخت چوٹیں آئیں۔ اسٹیئرنگ میری پسلیوں میں گھس گیا تھا اور میرا لبلبہ زخمی ہوا تھا۔ عاصم کے بھی سارے جسم پر چوٹیں آئیں مگر اتنی زیادہ شدید نہیں تھیں۔

حادثے کی جگہ سے ہمیں ایدھی ٹرسٹ کی تین ایمبولینسوں کے ذریعے عباسی شہید اسپتال پہنچایا گیا۔ البتہ اس سے پہلے کسی شریف آدمی نے ہمارے پاس موجود نقد رقم اور گھڑیاں وغیرہ اپنے قبضے میں کرلیں تھیں۔ رقم تقریباً ۵۲ ہزار روپے بنتی تھی۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ انسان بھی کیا عجب شے ہے کہ اپنے سامنے موت سے دوچار دوسرے انسانوں کو دیکھ کر بھی اسے اپنی موت یاد نہیں آتی۔

عباسی شہید اسپتال میں ہمارا علاج نہ ہوسکا اور سب کو مختلف ہسپتالوں میں منتقل کر دیا گیا۔ شروع شروع میں تو میرا مرض ہی تشخیص نہیں ہوسکا تھا۔ عباسی شہید اسپتال میں تو ایک ڈاکٹر صاحب نے میرے درد سے تڑپنے کی وجہ یہ بتائی کہ میں ہیروئن کا عادی ہوں اور نشہ نہ ملنے کی وجہ میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ چنانچہ وہ رات میں نے اپنے گھر پر تڑپ تڑپ کر گزاری مگر اگلے دن تین بجے کے قریب مجھے آغا خان اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں جدید ترین آلات اور ماہرین کی مدد سے میرا مرض تشخیص کرنے کی کوشش جاری رہی۔

ایک دن میں سی ٹی اسکیننگ کروا کے واپس آیا تو درد کی وجہ سے بُری حالت تھی اور میں

آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ میری معالج ڈاکٹر شائستہ خان اور دیگر ڈاکٹر حضرات آپس میں بڑے فکرمند انداز میں میرے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔(ڈاکٹر شائستہ خان سینے اور پیٹ کے امراض کی ماہر ہیں اور چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہوتی ہیں) گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اِن کا خیال تھا کہ میں انگریزی نہیں سمجھتا ہوں یا پھر وہ سمجھ رہے تھے کہ میں بے ہوش ہوں۔ بہرحال میں نے وہ ساری گفتگو سنی، جس کے مطابق میری زندگی صرف چوبیس گھنٹے کی رہ گئی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ڈاکٹر شائستہ خان سے دریافت کیا کہ آخر مجھے ایسی کونسی بیماری ہے کہ جس کا علاج بھی نہیں، اور میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکوں گا؟۔ میرے اس طرح پوچھنے پر انہیں حیرت بھی ہوئی اور شاید تشویش بھی کہ وہ ایک قریب المرگ مریض کے سامنے اس کی موت کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن میرے پُرسکون لہجے نے ان کی ہمت بندھائی اور ڈاکٹر شائستہ خان نے تفصیل سے میری بیماری کے بارے میں مجھے بتا دیا۔ یہ ٹرامیٹک پینکا ٹائٹسٹ کا کیس تھا۔ (ٹراما کے معنی ہیں حادثاتی اور پینکا ٹائٹسٹ، پینکریاز یعنی لبلبہ سے ہے)۔ ڈاکٹر حضرات کے مطابق اس مرض میں دس ہزار میں سے صرف دو مریضوں کے بچنے کی امید ہوتی ہے اور ایشیاء کی طبّی تاریخ میں ابھی تک ایسا کوئی شخص موجود نہیں تھا جو اس مرض کے بعد زندہ بچا ہو۔ (واضح رہے کہ میرے کیس کو کامیابی سے حل کرنے پر ڈاکٹر شائستہ خان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنے والی ہے) اپنے بارے میں معلوم ہونے کے بعد مجھے فوراً امی کا خیال آیا لیکن مجھے بتایا گیا کہ وہ دوسرے اسپتال میں زیرِ علاج ہیں اس لئے نہیں آسکتیں۔ دادی جان کی موت کی اطلاع البتہ مجھے پہلے ہی دے دی گئی تھی۔

لبلبے کا کام جسم میں شکر کی مقدار کو کنٹرول کرنا اور ہاضمے کیلئے تیزاب بنانا ہوتا ہے۔ یہ تیزاب قدرتی باریک رگوں کے ذریعے معدے میں جاتا ہے اور کھانا ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے لیکن حادثے میں میرا لبلبہ زخمی ہو کر پھٹ گیا تھا اور تیزاب معدے میں جانے کی بجائے جھلی میں جمع ہونا شروع ہو گیا جسے ایک خاص مدت کے بعد میرے پیٹ میں سوراخ کر کے نلکی کے ذریعے نکالا گیا۔ اس کی مقدار دو لیٹر کے برابر تھی۔

میرا پہلا آپریشن ۲، اکتوبر کو ہوا۔ یہ بڑا طویل آپریشن تھا اور اس میں میرے بچنے کا صرف ایک فیصد چانس تھا۔ لیکن اللہ کے فضل سے وہ آپریشن کامیاب رہا۔ اس آپریشن سے پہلے اور بعد میں بھی میں شدید درد میں مبتلا رہتا تھا۔ جب درد زوروں پر ہوتا تو میں تڑپ تڑپ کر کئی کئی فٹ بستر سے اچھلتا تھا اور مجھے قابو میں کرنے کیلئے کئی کئی آدمی اپنا پورا زور لگاتے تھے۔ میرے درد کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ دردِ دل کا ایک مریض اس وقت فوت ہو جاتا ہے جب اسے خون میں ساڑھے پانچ ہزار ایمیلیز

آتے ہیں۔ (ایمیلیز درد کی شدت کو ناپنے کا پیمانہ ہے) لیکن مجھے ساڑھے نوہزار ایمیلیز بھی آتے رہے ہیں۔ اتنے شدید درد کو سہار جانے میں جہاں میری کم عمری اور قوتِ برداشت کا دخل ہے وہیں اللہ کی خاص عنایت بھی ہے کہ جس نے مجھے اتنی ہمت عطا کی۔

مختلف اوقات میں میرے چار آپریشن ہوئے۔ اسی دوران میں میرے پیٹ سے چھ فٹ طویل آنت کاٹ کر نکال دی گئی اور پیٹ کی ایک جانب سوراخ کرکے آنت کو باہر نکالا گیا اور اس کے ساتھ ایک تھیلی باندھ دی گئی جس میں جسم کا تمام فضلہ جمع ہوتا رہتا تھا۔ تقریباً چھ ماہ تک میں اس کرب سے گزرتا رہا، البتہ اس دوران بھی میری قوتِ برداشت نے حیرت انگیز کمال دکھائے اور میں اس حالت میں موٹرسائیکل بھگاتا رہا۔

ہسپتال میں جسمانی درد کے علاوہ ایک بڑا دکھ یہ بھی تھا کہ امی جان مسلسل بیمار تھیں نہ وہ مجھے دیکھنے آسکیں اور نہ میں انہیں دیکھنے جاسکا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں امی جان سے اتنا دور رہا۔ میں دو بہنوں اور چار بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں لیکن کسی شیرخوار بچے کی طرح ایک دن بھی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں انہیں یاد کرکے روتا رہتا تھا۔ اسپتال میں میرے رونے کا ایک دوسرا سبب بھی تھا۔ حادثے کے دن سے لے کر نومبر کے آخر تک مجھے حلق کے ذریعے کھانے یا پینے کو ایک قطرہ بھی نہیں دیا گیا۔

بس ڈرپس کے ذریعے خوراک جسم میں پہنچائی جاتی تھی۔ میں جب دوسرے مریضوں کو کھاتے ہوئے دیکھتا تو دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی کہ میں بھی کھاؤں پیئوں مگر مجبور تھا۔ بے بسی سے میری آنکھوں میں آنسو آجاتے اور میں دیر تک روتا رہتا۔ میرے چھوٹے بھائی کے احتجاج پر کھانے کے وقت بستروں کے درمیان کے پردے کھینچے جانے لگے مگر پردے خوشبو کو تو نہیں روک سکتے تھے، تب مجھے خوشبو رُلاتی تھی۔ اس کا یہ علاج تلاش کیا گیا کہ کھانے کے وقت وارڈ میں روم فریشنر کا اسپرے کردیا جاتا تاکہ کھانوں کی خوشبو دب جائے۔

اس مہربانی کے علاوہ میری معالج ڈاکٹر شائستہ خان کی خاص توجہ، ڈاکٹر اجلال، ڈاکٹر عبید، میڈیکل اسٹوڈنٹ ڈاکٹر نگار اور نرس کریما کی بھرپور خدمت بھی مجھے حاصل رہی۔ میں تمام عمر ان لوگوں کا ممنون رہوں گا۔ انہیں کی وجہ سے میری صحت تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔

تقریباً تین ماہ بعد مجھے پہلی مرتبہ برف کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چوسنے کیلئے دیئے گئے۔اس وقت میری جو کیفیت تھی، الفاظ اس کے اظہار سے قاصر ہیں۔ میری آنکھیں بند تھیں اور آنسو رواں تھے۔ یوں محسوس ہورہا تھا کہ اتنی وسیع کائنات میں ان برف کے ٹکڑوں سے بڑی کوئی نعمت موجود نہیں ہے۔ ذہن میں قرآن کے یہ الفاظ گونج رہے تھے "تو تم اپنے رب کی کون کون سی

نعمت کو جھٹلاؤ گے۔" ایسی ہی کیفیت اس وقت بھی تھی جب میں نے پہلا نوالا لیا تھا اور اس وقت بھی جب چار ماہ بعد مجھے پہلی مرتبہ وہیل چیئر پر وارڈ سے باہر لایا گیا اور میں نے اذان کی آواز سنی۔ میں پابندی سے نماز ادا کرنے کا عادی ہوں لیکن ان چار ماہ میں میری یہ عادت چھوٹ گئی تھی۔ یہی کیا میں تو چلنا تک بھول گیا تھا۔ مجھے ایک بچے کی طرح دوبارہ چلنا سکھایا گیا۔

گھر آنے کے بعد بھی کافی عرصہ بستر پر رہا امی بدستور ہسپتال میں تھیں۔ مجھے ان سے ملاقات کرنے سے اس لئے روک دیا جاتا تھا کہ مجھے دیکھ کر انہیں تکلیف ہوگی۔ ایک بار میں نے کسی کو بتائے بغیر اسپتال جانے کی کوشش کی مگر موٹر سائیکل راستے میں خراب ہوگئی اور میں واپس آگیا۔ امریکہ سے ہماری خالہ آکر واپس جا رہی تھیں اور مجھے حیرت تھی کہ بیمار بہن کو چھوڑ کر وہ کیوں جا رہی ہیں۔ میرے بے حد اصرار پر ایک دن سب لوگ دادی جان کی قبر پر فاتحہ کیلئے گئے تو وہیں برابر والی قبر کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا گیا کہ یہ امی جان کی قبر ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے تو میرا دماغ سن ہو کر رہ گیا۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا اور نہ اب آتا ہے۔ امی جان کا وہی ہنستا مسکراتا چہرہ مجھے یاد ہے جب ہم لوگ کار میں حیدر آباد سے کراچی آرہے تھے۔ وہی آخری ملاقات۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے ابھی کہیں سے وہ ہنستی مسکراتی آجائیں گی اور مجھے گلے لگالیں گی۔ اکثر میں بہت اداس ہو جاتا ہوں، امی جان بہت یاد آتی ہیں، ایسے میں میں کہیں دور نکل جاتا ہوں ............ تنہائیوں میں ............ اور خوب روتا ہوں............

ایک میں ہی نہیں گھر میں تقریباً سب کی یہی حالت ہے۔ میرا چھوٹا بھائی صائم بارہ سال کا ہے اور ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے وہ امی سے بہت زیادہ قریب تھا۔ ایک دن کتابوں کی صفائی کے دوران اس کا ایک خط میرے ہاتھ لگا جو اس نے امریکہ میں خالہ جان کے نام لکھا تھا مگر پوسٹ نہیں کر سکا تھا۔ آج بھی وہ خط صائم کی دراز اور میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس نے لکھا تھا،

"خالہ بی اب گھر بہت خالی خالی لگتا ہے۔ پہلے جب میں اسکول سے آتا تھا تو امی مجھے میٹھا پراٹھا پکا کر دیتی تھیں لیکن اب میں نے میٹھا پراٹھا کھانا چھوڑ دیا ہے کیونکہ میٹھا پراٹھا کھاتے ہوئے مجھے امی بہت یاد آتی ہیں۔ خالہ بی امی میرے ساتھ کیرم بورڈ کھیلتی تھیں اور مجھے اسکول کا ہوم ورک کرواتی تھیں لیکن اب مجھے ہوم ورک خود کرنا پڑتا ہے اور کھیلنا میں نے چھوڑ دیا ہے۔ خالہ بی مجھے بہت رونا آتا ہے جب امی یاد آتی ہیں لیکن میں اس لئے نہیں روتا کہ میرے رونے سے ابو کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور ابو بہت افسردہ ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی اکثر میں نے ابو کو راتوں کو چھپ چھپ کر روتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں تو اتنا چھوٹا ہوں کہ ابو کو تسلی بھی نہیں دے سکتا۔ اب ابو مجھے پہلے سے زیادہ پیار

کرتے ہیں کیونکہ میں سب سے چھوٹا ہوں اس لئے ابو کو میری بہت فکر رہتی ہے۔ شروع دنوں میں امی کے انتقال کے بعد ابو میرا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ صبح صبح منہ ہاتھ دھلانا، اپنے ہاتھوں سے میرے کپڑے استری کرنا، ہر جگہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا۔ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ میں ابو سے امی کی باتیں کروں لیکن اس ڈر سے نہیں کرتا کہ ابو اداس نہ ہو جائیں۔ میں چپ رہتا ہوں۔ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ آپ یہاں تھیں تو آپ میں سے امی کی خوشبو آتی تھی بہت اچھا لگتا تھا لیکن آپ بھی امریکہ واپس چلی گئیں۔ سچ کہتا ہوں امی اب بھی بہت یاد آتی ہیں......................"

بیماری کے دنوں میں میں نے بہت سخت جسمانی تکلیف برداشت کی تھی لیکن امی جان کی جدائی کا دُکھ اس سے بہت زیادہ شدید ہے۔ سوچتا ہوں کہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دُکھ بھی کم ہو جائے................ یا شاید نہ ہو!


**خبردار۔ تمباکو نوشی صحت کے لئے مُضر ہے**

**وزارتِ صحت —— حکومتِ پاکستان ——**

یہ اشتہار صرف سگریٹ پینے والوں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ سگریٹ نہ پینے والوں کے لئے بھی پیشگی ہدایت ہے کہ وہ اس خطرے سے دور رہیں جس کا انجام بیماری اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں —— یاد رکھئے

سگریٹ کا دھواں بھی سگریٹ نوشی کی طرح مُضر ہے۔

**اپنی صحت کا خیال رکھئے**

**سگریٹ نوشی سے خود بچئے —— دوسروں کو بچائیے**

ماہنامہ آنکھ مچولی سگریٹ کے اشتہار شائع نہیں کرتا۔ مشتہرین زحمت نہ کریں۔ (ادارہ)

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

خصوصی بچت اسکیم

# آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
# کتنے سستے کتنے پیارے

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۱۰/ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی رعایت یعنی ۲۱۰/ کے بجائے صرف ۱۵۰ روپے۔ اس طرح گویا مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

۵۰/ روپے کی
خصوصی رعایت اور
تحفہ مفت

آنکھ مچولی بیرون ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۲۰۰/ روپے
زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوادیں

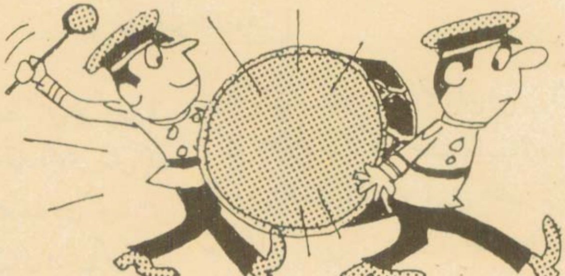

ماھنامہ
آنکھ مچولی
۱۱۲-ڈی، نورس روڈ
سائٹ، کراچی

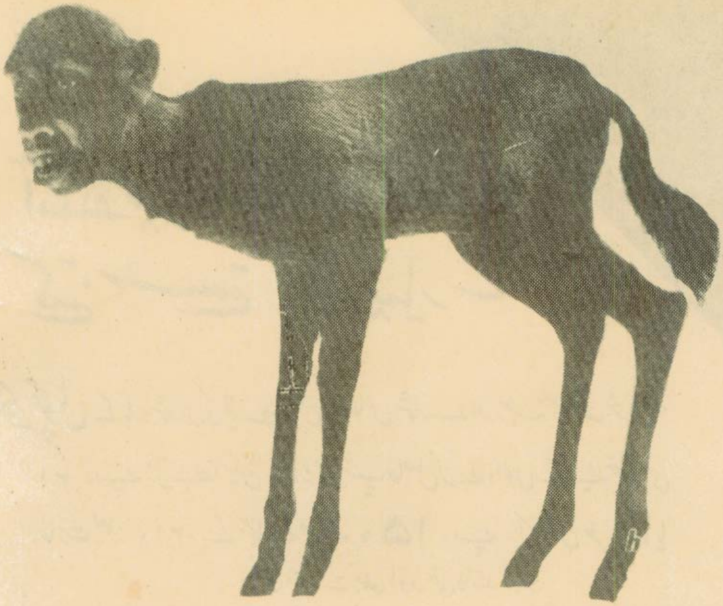

# MANNIE = انسان + گھوڑا

طاہر مسعود

ایمسٹرڈیم کی وہ شام نہایت سنسنی خیز تھی۔ ہال صحافیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں ایک نہایت اہم پریس کانفرنس ہونے والی تھی۔ اس پریس کانفرنس سے ڈاکٹر پیٹر ڈی وریس کو خطاب کرنا تھا جو ماہر جینیات (Gene ticist) تھے۔ صحافیوں کو یہ تو معلوم تھا کہ پریس کانفرنس میں ڈاکٹر وریس اپنے کسی تازہ تجربے کی کامیابی کے بارے میں انکشاف کرنے والے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کو نہیں معلوم تھا کہ وہ انکشاف کیا ہے؟ وقت مقررہ پر ڈاکٹر وریس ڈائس پر آئے، کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پھر اپنی آدھے گھنٹے کی گفتگو میں انھوں نے جو کچھ بیان کیا وہ صحافیوں کے لئے ناقابل یقین تھا...... حیرت انگیز اور ناقابل یقین۔

ڈاکٹر وریس نے بتایا کہ ہم کافی عرصے سے اس

بات کی کوشش کر رہے تھے کہ انسان اور حیوان کی جینیات کے مرکب سے کوئی ملی جلی مخلوق تخلیق کر سکیں۔ برسوں ہم نے اس پر غور و فکر کیا اور مختلف قسم کے تجربات کئے۔ آخر کار ہمیں اپنے تجربے میں کامیابی حاصل ہو گئی اور اب ہم ایک ایسا گھوڑا پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کا دھڑ تو گھوڑے کا ہے لیکن چہرہ انسان کا۔ اور اسی مناسبت سے اس کا نام Mannie رکھا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ Mannie بالکل نارمل ہے۔ اس کا سر بالوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں، ناک، منھ، زبان، رخسار سب کے سب انسانی ہیں۔ بلکہ اس کا دھڑ چھپا دیا جائے تو یہ دیکھنے میں انسان ہی محسوس ہو گا۔

ڈاکٹر وریس نے اپنے تجربے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک انسانی چہرے والے گھوڑے کی تخلیق کا فیصلہ چار سال پہلے کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے لئے ۲ ملین ڈالر (تقریباً پانچ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے) کی رقم درکار تھی۔ اور جب رقم فراہم ہو گئی تو ہمارے لئے یہ تجربہ کرنا ممکن ہو گیا۔ اس تجربے میں ایک انڈے میں ایک انسان اور ایک گھوڑے کا جینیاتی مواد داخل کر دیا گیا اور پھر اس انڈے کو ایک گھوڑی کی بچہ دانی میں رکھ دیا گیا۔ جس کے بعد اس گھوڑی نے پچھلے موسم بہار میں ایک انسانی چہرے والا بچھڑا جنم دیا انہوں نے کہا کہ یہ تجربہ اتنا انقلابی ہے کہ اس کے بعد ہمیں جینیات کی نصابی کتابوں کو نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ ڈاکٹر وریس کا کہنا تھا کہ وہ تکنیک جن کی مدد سے ہم نے اس عجیب و غریب گھوڑے کو تخلیق کیا ہے، کوئی بہت نئی نہیں ہیں۔ اس تکنیک کو کینسر اور دوسرے مہلک امراض کو دور کرنے کے لئے پہلے بھی استعمال کیا جا چکا ہے ...... اور ہمیں یقین ہے کہ اس تخلیق کے دوران جو کچھ ہم نے سیکھا ہے اس کے ذریعے ہم دیگر امراض کا علاج بھی دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر وریس نے بتایا کہ Mannie کی صحت نہایت شاندار ہے اور وہ اتنا ہی خوش ہے جتنا کوئی بھی جانور ہو سکتا ہے۔ اس تجربے سے اس کا دماغ متاثر نہیں ہوا ہے اور وہ مختلف موقعوں پر اپنے تاثرات کا بھی اظہار کرتا ہے۔ مثلاً جب اسے کھانے کے لئے سیب دیا جائے تو وہ خوش ہو کے مسکراتا ہے۔

............○............○............

ڈاکٹر پیٹر ڈی وریس کے اس کامیاب اور حیرت انگیز تجربے کی تفصیلات امریکہ کے اخبار "ویکلی ورلڈ نیوز" کے ۶ اگست ۱۹۹۱ء کے شمارے میں شائع ہوئیں۔ سرورق پر انسانی چہرے والے گھوڑے کی تصویر اس سرخی کے ساتھ نمایاں تھی۔ Horse born with human face اسے پڑھ کے آپ کی طرح ہماری عقل بھی دنگ رہ گئی۔ اگلے دن ہم نے جامعہ کراچی کے شعبہ جینیات کے اساتذہ کرام سے رابطہ قائم کیا۔ اور

دریافت کیا کہ کیا انھیں اس تجربے کے بارے میں کچھ علم ہے۔ شعبے کے استادوں نے ویکلی ورلڈ نیوز کی اس خبر کو نہایت دلچسپی سے پڑھا اور پھر کہا کہ ہمارے لئے یہ کسی انکشاف سے کم نہیں۔ جینیات کے موضوع پر جتنے معروف تحقیقی رسائل و جرائد چھپتے ہیں، وہ سب ہماری لائبریری میں آتے ہیں۔ اور حیرت کی بات ہے کہ ان جرائد میں ایسے کسی تجربے کے بارے میں کوئی مضمون ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر واقعی کسی ایسے جانور کی پیدائش ہوئی ہے تو یہ سائنسی دنیا کی بہت بڑی خبر ہے جس پر ساری دنیا میں تہلکہ مچ جانا چاہئے تھا۔ ہم نے کہا مگر یہ کوئی سائنسی جواب تو نہ ہوا۔ اس پر شعبے کی استاد محترمہ فرزانہ ناصر نے کہا کہ ہمارے مضمون میں جدید تحقیق جہاں تک ہوئی ہے اس کی رو سے بھی یہ خبر نا قابل یقین ہے۔ ایک انڈے میں انسان اور گھوڑے کا جینیاتی مواد داخل کر دینا شاید آسان ہو لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ خود بخود جینیاتی مواد کی نشوونما اس طرح ہو جائے کہ چہرہ تو مکمل انسانی ہو جائے اور دھڑ مکمل گھوڑے کا۔ یہ دعویٰ تو وہی کر سکتا ہے جو جینیات کے ابتدائی اصولوں اور مسائل سے واقف نہ ہو۔ فرزانہ ناصر صاحبہ نے یہ بھی کہا کہ جینیات کے علم میں جو تجربات ہو رہے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی نشوونما بہتر سے بہتر طریقے سے ہو لیکن گھوڑے کے جسم میں انسانی چہرے کا تجربہ تو انسان کو مسخ کرتا ہے یہ انسانیت کی تذلیل ہے۔ شعبے کی ایک اور

استاد محترمہ طلعت حیدر نے بھی اس خبر کو مضحکہ خیز قرار دیا اور سوال کیا کہ اس تجربے سے صرف چہرے ہی میں تبدیلی کیوں آئی۔ بات واقعی صحیح تھی کیونکہ تمام مخلوقات پر غور کیجئے تو ان کے پیچھے آپ کو ایک خالق کا ذہن اور اس کا منصوبہ کارفرما نظر آئے گا۔ چیونٹی سے انسان تک۔ بنانے والے نے انھیں سوچ سمجھ کے بنایا ہے۔ اور دور کیوں جایئے انسان ہی جب کوئی معمولی سی میز بھی بنانا چاہتا ہے تو اس کا ڈیزائن اپنے ذہن میں سوچتا ہے۔ اور پھر اس کے مطابق میز بنانے کی کوشش کرتا ہے تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ الل ٹپ طریقے سے انسانی جسم کا وہ حصہ تخلیق ہو جائے جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے یعنی انسان کا چہرہ۔ یہ اتنی آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ڈاکٹر پیئر ڈی وریس کے انکشاف کو جھٹلانے کے لئے بہت زیادہ دلائل دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ پھر ایسی خبر امریکہ کے ایک ہفت روزے میں کیسے شائع ہو گئی۔ اس کا جواب اسی شعبے کے ایک ایم فل کے طالب علم جنید احمد خان نے دیا۔ انھوں نے خبر پڑھتے ہی کہا۔ "اوہو، یہ تو وہاں کا شام کا اخبار لگ رہا ہے!" پھر اگلا سوال تھا کہ "خبر جھوٹی ہے تو پھر تصویر کہاں سے آ گئی؟" مگر پینٹنگ اور فوٹو گرافی کی ترقی کے اس دور میں یہ سوال زیادہ توجہ کے قابل نہ تھا اصل بات یہ تھی کہ امریکی جریدے بھی اتنا سفید جھوٹ لکھ سکتے ہیں؟

# ٹھنڈے ابو

مجیب ظفر انوار

"ٹھنڈے ابو" لو بھلا یہ بھی کسی کہانی کا نام ہوا ............

بھئی تم میری کہانیاں پڑھا کرو، ان کے ناموں میں نہ الجھا کرو، بر سہا برس سے تمہارے۔ لئے ایسی ہی کہانیاں تو لکھ رہا ہوں اچھا چھوڑو...... نئی کہانی سنو۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ سالانہ امتحانات کے بعد جب میری چھٹیاں ہوئیں اور شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہو گئیں اور مجھے ان تعطیلات کو گذارنے کا کوئی بھلا طریقہ سمجھ میں نہ آیا تو میں چڑ گیا۔

سخت گرمیوں میں ایک دن ہی اللہ اللہ کر کے کٹتا ہے اور کہاں دو اڑھائی مہینے۔ میں سخت ذہنی کوفت میں مبتلا تھا۔ وی۔ سی۔ آر اور اسی طرح کے دوسرے تفریحی لوازمات کا مجھے شوق نہیں، کتابی کیڑا میں بن نہیں سکتا، بس گذارنے کے لائق مطالعہ کر لیتا ہوں۔

آؤٹ ڈور گیمز کا میں شائق نہیں

صاحب! بڑی مصیبت ہو گئی تھی۔

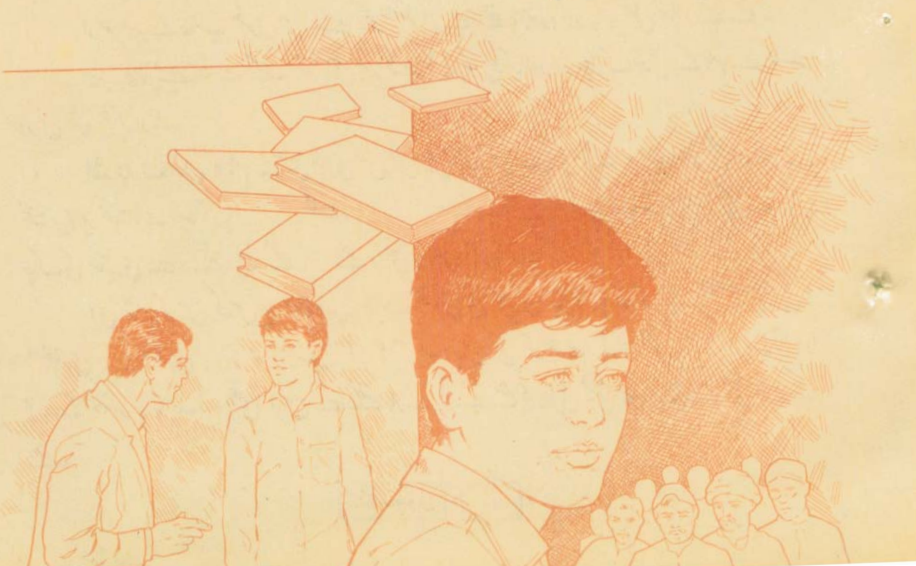

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں "استاد" بن جاؤں۔ یعنی "ٹیچر" اور چھوٹے بچوں اور ایسے افراد کو پڑھاؤں جنہیں واقعی تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہو۔ یہ ایک ایسا خیال تھا جسے میرے گھر والوں کو رد نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اسی لئے میں نے اپنے والدین کی اجازت کے بغیر اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا انتظام شروع کر دیا۔ امی ابو کو اسی لئے نہیں بتایا کہ اچانک سرپرائز دوں گا۔ تعطیلات ختم ہونے میں کم عرصہ رہ گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ افراد کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنا دوں۔

چنانچہ اپنے جگری دوست سلیم کی مدد سے میں نے اپنے طالب علم اکٹھے کئے اور لان میں کینوس بلیک بورڈ فٹ کر کے کلاس شروع کر دی۔ کینوس بلیک بورڈ کو یوں سمجھو کہ یہ ایک طرح کا اسٹینڈ والا بلیک بورڈ ہوتا ہے، اسٹینڈ پر رکھا جاتا ہے اور کلاس روم کے تختہ سیاہ کی طرح ہی کام انجام دیتا ہے، لیکن ہوتا پلائی (لکڑی) کا ہے۔

خیر...... میرے طلباء میں گل خان تھا، قادر علی تھا، نوید تھا، بشیر خان تھا، طاہر ملک تھا، مسعود تھا، انور بیگ تھا، چاچا رحمت تھے جو چھولے دہی بھلّے بیچنے کے باوجود پڑھنے کا شوق رکھتے تھے، بدر چوکیدار تھا جو دن کے وقت بجائے سونے کے پڑھنا چاہتا تھا، نورا مالی تھا جو ہمارے گھر کا مالی تھا اور لان کی سجاوٹ کے علاوہ دیگر کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ یہ تو ایک تعارفی فہرست ہوئی میرے طالب علموں کی............ میں ساتویں جماعت پاس ............ بلکہ آٹھویں پاس ہی جانئے ...... کیوں کہ تمام پرچے بڑے اچھے ہوئے تھے ............ بھلا پڑھاؤں تو کس طرح؟

ادھر میرے طالب علموں میں سے کچھ مسکرا رہے تھے باقاعدہ اور کچھ کھل کھلا رہے تھے۔

میرے تو پسینے چھُوٹ گئے۔ بہر حال جگر لخت لخت کو جمع کیا اور اللہ تبارک تعالیٰ کے نام سے سلسلہ درس شروع کر دیا۔

اللہ تبارک تعالیٰ کا نام لیتے ہی میری نس نس میں ایک ان جانی سی قوت سرائیت کر گئی اور پھر میں تختہ سیاہ پر لکھتا رہا۔ مٹاتا رہا............ لکھتا رہا............ مٹاتا رہا............ میرے ہاتھ، چہرہ، کپڑے، بال چاک کی سفیدی سے رنگتے چلے گئے...... مجھے واقعی بڑا مزہ آ رہا تھا۔

اسی شام کو میں گھاس پر بیٹھا اپنے طالب علموں کی کاپیاں جانچ رہا تھا کہ ایک چیخ سنائی دی! "ظفری ...... ظفری ...... فوراً یہاں آؤ!" ابو جان کی کرخت آواز تھی۔ میں دوڑتا ہوا ان کے حضور جا پہنچا۔ وہ ابھی آفس سے تھکے ہارے لوٹے تھے اور اپنی قیمتی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر رہے تھے۔

"جی ابو ؟"

"احمق ...... بے وقوف ............ یہ میرے لان میں محتاج خانہ کیوں کھولا تھا ؟" گرج کر پوچھا۔

میں بوکھلا گیا کہ ابو کے سوال کا کیا جواب دوں۔

"بولو...... یہ تمہارا گھر ہے کہ جو جی چاہئے کرو، یہ میری محنت کی کمائی کا مکان ہے، سمجھے، یتیم خانہ نہیں ہے۔" ابو انتہائی غصے میں تھے، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بولو...... تم نے پرمیشن لی تھی مجھ سے اس گھٹیا کام کی ؟"

"ابو...... تعلیم دینا گھٹیا کام ہے ؟" میں نے اپنی ساری ہمت جمع کر کے پوچھا لیکن ایک "چانٹا" میرا مقدر بنا۔ میں چکرا کر رہ گیا۔

"دفع ہو جاؤ...... دور ہو جاؤ میری نظروں سے !"

میں روتا ہوا واپس آ گیا۔ دو دن بعد امی جان کی گود میں منہ چھپا کر رونے سے مجھے ابو کے غصے کی اصل وجہ پتا چل گئی۔

بات دراصل یہ تھی کہ گل خان پٹھان تھا، بدر چوکیدار بلوچی تھا، انور بیگ اور گڈو مہاجر تھے، نورا اور چاچا رحمت سندھی تھے۔ باقی طالب علموں کی بھی ابو نے اسی طرح فرقہ و درجہ بندی کی تھی۔ امی جان مجھے یہ بات کبھی نہ بتاتیں لیکن میری حالت غیر ہو چکی تھی۔ کھانا تک نہ کھایا جاتا تھا............ پھر............ میرا رزلٹ کافی تاخیر سے آؤٹ ہوا اور مجھے سائنس گروپ میں داخلہ مل گیا۔ اور پھر...... جب ابو کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرا اسکول کھل چکا تھا۔ صبح میں اچھا بھلا اسکول گیا۔ شام کو ابو اچھے بھلے دفتر سے گھر آئے۔ مجھے بلایا۔ خواہ مخواہ گلے لگایا۔

"ابو............ " میں الگ ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں میرے بیٹے............ کہو کیا بات ہے ؟"

"ابو............ میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گا۔ مجھے آپ پڑھنے کے لئے ملک سے باہر بھیجوا دیجئے۔"

ابو بونچکا رہ گئے۔

"کیوں ؟" ان کا لہجہ سخت تھا۔

"ابو............ پلیز آپ ناراض ہرگز نہ ہوں۔ دراصل میرے سندھی کے استاد ششپال سر سندھی ہیں، اسلامیات اور اردو کے بدر صاحب اور مس عظمیٰ مہاجر ہیں، بیالوجی کی مس گل پٹھان ہیں اور

کیمسٹری کی مس کوکب کے والدین بلوچستان کے ہیں، یعنی بلوچی ہیں۔ ابو ...... جب میں ان قوموں کے لوگوں کو پڑھا نہیں سکتا، تو ابو پھر میں ان لوگوں سے پڑھ بھی نہیں سکتا، ان لوگوں سے تعلیم حاصل کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے، ابو اللہ کے لئے مجھے انگریزوں کے دیس میں بھیج دیں کیوں کہ پاکستان میں تو یہ ہی قومیں ہیں، یہ ہی لوگ ہیں، ابو مجھے امریکہ بھیج دیں۔ ابو...... اللہ کے لئے ابو ............"

"چٹاخ !!!" اتنا شدید چانٹا میرے منہ پر پڑا تھا کہ میری چیخ تک دب گئی۔

لیکن اللہ گواہ ہے! یقین کرو ابو بالکل ٹھنڈے ہو رہے تھے، ان کا ہاتھ یخ تھا...... ٹھنڈے ابو...... ہنھ ...... ٹھنڈے کہیں کے !!!!

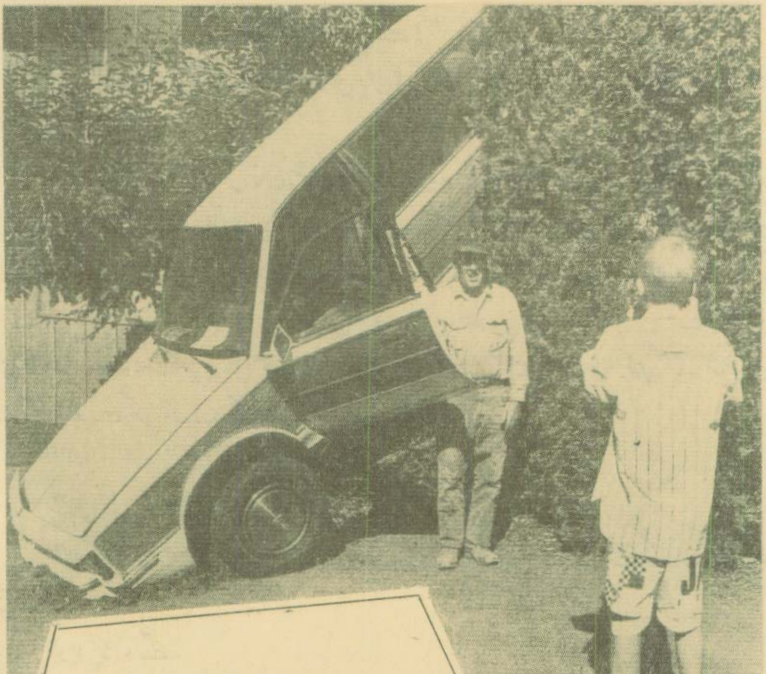

ایک پوز اپنا، ایک کار کا۔

# جگنو

ضیغم حمیدی

ٹھنڈی ہوا میں کیسے جگنو چمک رہے ہیں
جیسے ہوا میں ننھے دیپک دمک رہے ہیں

ننھے سے یہ دیئے بھی جلوہ نما عجب ہیں
راتوں کو جاگتے ہیں، سوتے یہ جانے کب ہیں

گلشن کے سب نظارے ان سے نکھر گئے ہیں
نیلے فلک سے جیسے تارے اتر گئے ہیں

جگنو کی روشنی میں جلوہ نما ہے قدرت
پھر بھی یہ دوستو ہے ادنیٰ کمالِ فطرت

برسات کی اندھیری راتوں کو جگمگائیں
یونہی چمک چمک کر شانِ خدا دکھائیں

یہ دن کی روشنی میں اپنا ہی منہ چھپاتے
راتوں کی محفلوں کی رونق ہیں یہ بڑھاتے

ہے کام ان کا ضیغم اوروں کے کام آنا
بھٹکے ہوؤں کو سیدھا اک راستہ دکھانا

یہ کام کی نصیحت بچّو نہ تم بھلانا
جگنو کی طرح تم بھی لوگوں کے کام آنا

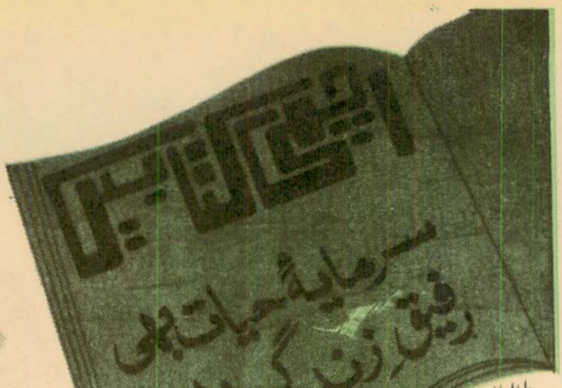


طالبانِ
علم وادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ہی فائدہ اٹھائیے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

| | موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ | بعد از رعایت مع ڈاک خرچ |
|---|---|---|
| ۱ سب سے بڑا انسان۔ سیرت طیبہ پر سید نظر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ۔ ڈی لکس ایڈیشن | ۴۰ روپے | ۲۵ روپے |
| ۲ راہ نما<br>قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ | ۱۰ روپے | ۸ روپے |
| ۳ سفرمبارک<br>حجاز مقدس کا سفر نامہ بھی راہنما بھی | — | صرف ڈاک خرچ ۴ روپے |
| ۴ تعلیم الاسلام<br>۴ حصوں پر مشتمل۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات | — | صرف ڈاک خرچ ۴ روپے |
| ۵ حق اسکواڈ<br>مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ | ۱۰ روپے | ۸ روپے |
| ۶ کہنا بڑوں کا مانو<br>تعمیر سیرت اطفال کے لئے خوبصورت | ۴ روپے | ۳ روپے |

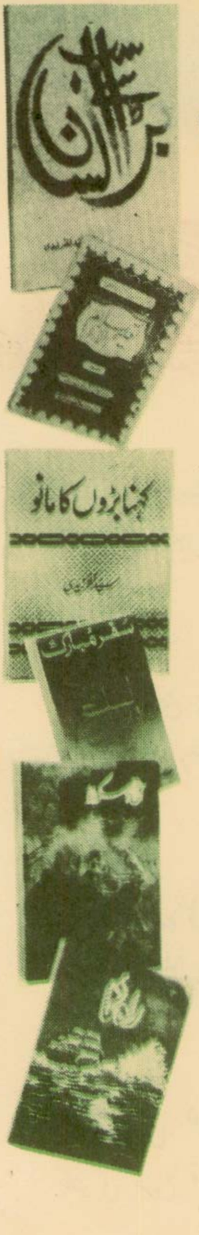


آپ صرف ۵۰ روپے کا منی آرڈر بھیجوا کر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں
پتا:۔ گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ۱۱۲۔ ڈی سائیٹ کراچی نمبر ۱۶۔

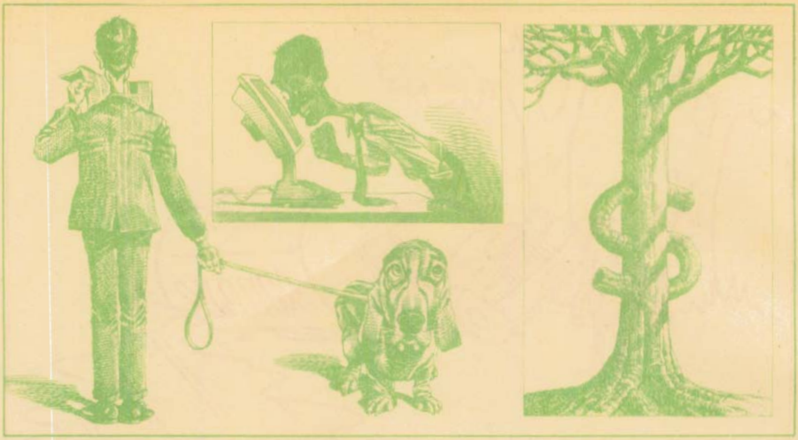

# ڈنڈا ڈولی

### انعامی لطیفہ

ایک لڑکے کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے ابو اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے پوچھا "یہ زخم کیسے آیا؟"

"یہ دیوار میں پیپر ویٹ کی مدد سے کیل گاڑ رہا تھا۔" باپ نے بتاتے ہوئے کہا "میں نے اس سے کہا کہ پیپر ویٹ کی بجائے کسی اور چیز سے کیل گاڑو، کچھ عقل سے کام لو، کھوپڑی استعمال کرو اور پھر اس نے پیپر ویٹ رکھ کر کھوپڑی استعمال کی۔"

رضوان کریم۔ (؟)

ایک شخص کے پاس ایک کتا اور ایک مرغا تھا۔ دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ ایک دن کتے نے مرغے سے پوچھا کہ جب مالک مجھے بلاتا ہے تو میں اس کے پاس جلدی سے چلا جاتا ہوں لیکن جب تمہیں بلاتا ہے تو تم بھاگتے ہو اس سے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ مرغے نے جواب دیا کہ مالک کے پاس جو میں نے دیکھا ہے وہ تم نے نہیں دیکھا۔ کتا بولا، کیا؟

مرغے نے جواب دیا "بھنے ہوئے مرغ"

جواد الحسن۔ اسلام آباد

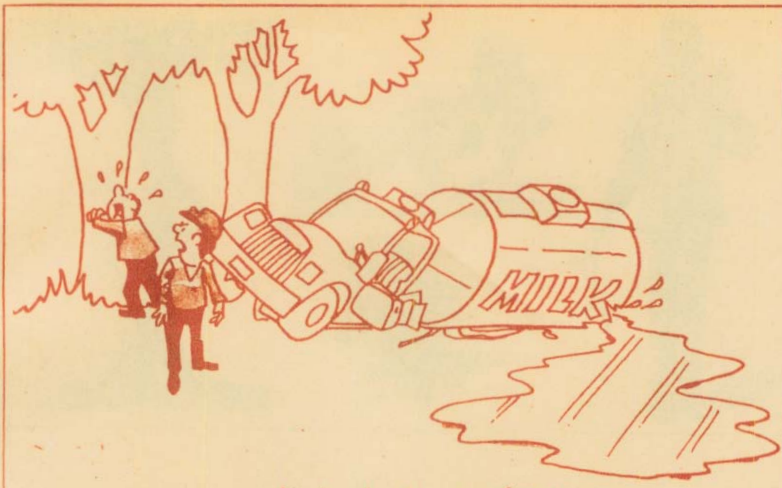


سالما دُدّو گرا دیا.... اُوں اُوں اُوں اُوں.....

ایک دوست (دوسرے سے):۔ یار میرے ساتھ بازار چلوگے میرے برش کاایک بال ٹوٹ گیا ہے نیاخریدنا ہے۔

دوسرا دوست:۔ تم اتنے فضول خرچ کب سے ہوگئے ہو کہ ایک بال ٹوٹنے پر نیا برش۔

پہلا دوست:۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ میرے برش کا آخری بال تھا۔

آبیہ سید امتیاز علی۔ کراچی

استاد (شاگرد سے۔) بتاؤ یہ کونسا زمانہ ہوگا۔

"تم نقل کر رہے ہو۔ وہ نقل کر رہا ہے۔ ہم سب نقل کر رہے ہیں۔"

شاگرد:۔ ماسٹر صاحب یہ زمانہ امتحان کا ہوگا۔

صولت رعنا چوہدری ۔ راولپنڈی

انگلستان میں ایک مستری بس کے حادثے میں زخمی ہوگیا۔ اس نے بس کمپنی پر ہرجانے کا دعویٰ کرتے ہوئے بیان دیا کہ اس کا دایاں بازو حادثے کی نذر ہوگیا ہے۔ وکیل نے جرح کرتے ہوئے کہا۔

"اپنا ہاتھ اٹھا کر دکھاؤ کہ وہ کہاں تک اٹھتا ہے۔" مستری نے اپنا دایاں ہاتھ ایک انچ تک اوپر اٹھایا۔

"اب اپنا ہاتھ وہاں تک اوپر اٹھاؤ جہاں تک تم حادثے سے پہلے اٹھایا کرتے تھے۔"

مستری نے جلدی سے وہی ہاتھ اٹھایا اور سر کے اوپر تک لے گیا۔ وکیل، جج کی طرف مخاطب ہوکر بولا۔

"جناب! ملاحظہ فرمایئے ہرجانے کی ضرورت باقی نہیں رہی، میں نے مستری کا بازو ٹھیک کر دیا ہے۔"

غلام عباس طاہر۔ جھنگ

کان قریب لاؤ- ایک اہم خبر ہے-

ایک تھا گیدڑ- اسے کہیں سے ہاتھ لگا ایک کاغذ کا ٹکڑا- ٹکڑا لے کر وہ اکڑتا ہوا اپنے ساتھی گیدڑوں کے پاس گیا- ان سے کہنے لگا:

"میں بڑے مالک سے اجازت لے کر آیا ہوں یہ دیکھو پروانہ، آؤ ہم سب مل کر خربوزے کھانے جاتے ہیں سبھی خوشی خوشی اس کے ساتھ ہولئے- خربوزوں کے کھیت میں گھسنے لگے تو مالکوں نے ان پر کتے چھوڑ دیئے- گیدڑ بھاگنے لگے تو سب گیدڑوں نے پروانے (خط) والے گیدڑ سے کہا کہ ان کو بڑے مالک کا پروانہ (خط) دکھاؤ- لیکن وہ گیدڑ سرپٹ دوڑنے لگا اور بھاگتے ہوئے کہتا جاتا تھا-

"بھاگو بھاگو یہاں سے......ان پڑھوں سے واسطہ پڑ گیا ہے-" مہر احمد نواز لیل-

ایک فقیر نے نہایت عاجزی سے ایک دروازے پر دستک دی- مالکن نے غصے سے دروازہ کھولا اور بولی "کیا چاہتے ہو تم؟"

فقیر نے ہتھیلی پر رکھا ہوا بٹن آگے کیا اور بولا- "خدا کے نام پر اس بٹن میں کوٹ ٹانک دیں-"

سید افتخار دانش، کراچی

ایک رسالے کا رپورٹر ایک کسان سے انٹرویو لے رہا تھا- اس نے سوال کیا- "کیا آپ کے ہمسائے ایمان دار ہیں؟" "بالکل" کسان نے جواب دیا- رپورٹر نے مرغیوں کے باڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا- "اگر یہ بات ہے تو آپ نے وہاں بھری ہوئی شاٹ گن کیوں رکھی ہوئی ہے؟" "اپنے ہمسایوں کو ایمان دار رکھنے کے لئے-" کسان نے مسکرا کر جواب دیا-

اعزاز حسن......اسلام آباد

جو ایسا ہو تو کیسا ہو....؟

ایک کنجوس نے اپنے بچوں سے کہا "جو بچہ رات کو کھانا نہیں کھائے گا اسے ایک روپیہ ملے گا۔

بچے ایک ایک روپیہ لے کر بھوکے سو گئے۔ جب صبح ہوئی تو کنجوس نے کہا "جو بچہ ایک روپیہ دے گا اسے ناشتہ ملے گا۔"

نوید اختر۔ کراچی

ایک نجومی کشتی میں سوار ہوا اور ملاح سے کہنے لگا "تو نے گرامر پڑھی ہے"۔ اس نے کہا "نہیں"۔ نجومی بولا "پھر تیری آدھی عمر برباد ہو گئی"۔ ملاح کو بہت غصہ آیا لیکن چپ رہا۔ اتنے میں طوفان آگیا اور کشتی ڈوبنے لگی۔ ملاح نے نجومی سے پوچھا "آپ کچھ تیرنا بھی جانتے ہیں"۔ نجومی نے جواب دیا "نہیں"۔ ملاح بولا "پھر آپ کی ساری عمر ضائع ہو گئی کیونکہ کشتی ڈوبنے والی ہے"۔

(محمد طارق حفیظ)

منّا (روتے ہوئے) ... امّی میں کل اسکول نہیں جاؤں گا۔

ماں ...... وہ کیوں؟

منا ...... امی آج اسکول میں مجھے تولا گیا ہے کل یقیناً بیچ دیا جائے گا۔

فائزہ الیاس ...... کراچی

امریکہ میں مردم شماری کرنے والوں نے ایک دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک بوڑھا شخص نمودار ہوا۔ "ہمیں صدر نے بھیجا ہے تاکہ ہم جان سکیں کہ امریکہ میں کتنے لوگ رہتے ہیں"

میں باہر آنے کا راستہ نہیں پوچھ رہا۔ مجھے تو باتھ روم کا راستہ بتادیں۔

مردم شماری کرنے والوں نے اپنی آمد کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ اتنی تکلیف کر کے یہاں میرے پاس پوچھنے آئے ہیں۔ لیکن مجھے امریکہ میں بسنے والوں کی تعداد کا کوئی علم نہیں۔" پروین کنول خانیوال

پہلا شیخی باز ...... یار میرے داد نے ایک مرتبہ مٹکا اٹھا کر اوپر پھینکا پانی تو گر گیا مٹکا تار سے لٹک گیا

دوسرا شیخی باز ...... یہ بھی کوئی بات ہے میرے دادا نے مٹکا اوپر پھینکا مٹکا تو گر کر ٹوٹ گیا مگر پانی تار سے لٹک گیا۔ (فائزہ حسن ..... کوٹ نظام الدین)

ایک شخص نے دوسرے سے شرط لگائی کہ مجھ سے جلدی کوئی نہیں نہا سکتا کیونکہ میں صابن نہیں لگاتا۔

دوسرا بولا۔ میں تم سے بھی جلدی نہا سکتا ہوں کیونکہ میں پانی نہیں لگاتا۔

سہیل احمد، راولپنڈی

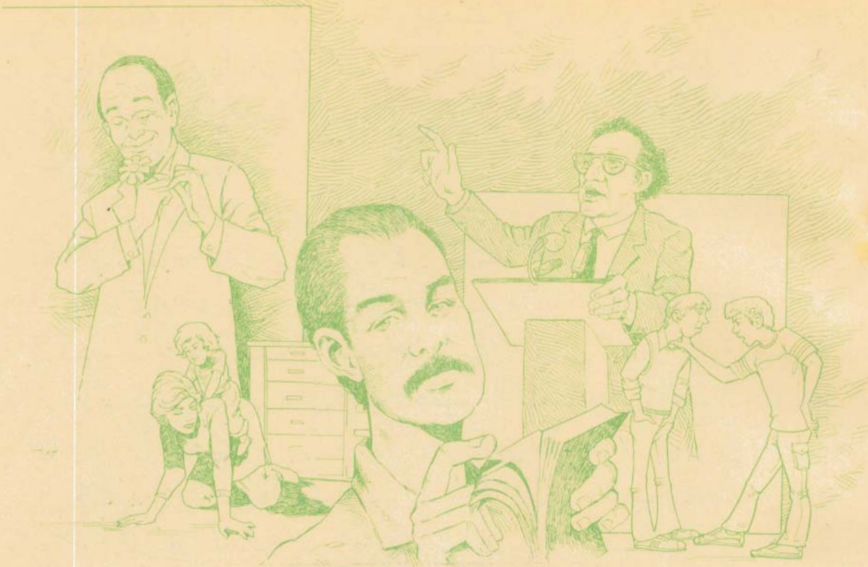

# اِن سے مِلئے
# یہ ہیں حضرت انسان

شیخ عبدالحمید عابدؔ

### اس مضمون پر مسکرانے کا مطلب ہے اپنے آپ پر مسکرانا!

بے شک انسان ایک عظیم مخلوق ہے۔ لیکن گرانی کے اس زمانہ میں اس کی قیمت صرف چند روپے ہے۔ کیونکہ اس کے جسم کے اندر صابن کی سات ٹکیاں بنانے کے لائق چربی اور دو انچ کی ایک کیل برابر لوہا ہے چھ پیالی چائے کے لائق شکر اور دیا سلائی کی ساٹھ تیلیاں بنانے کے لئے فاسفورس، دو چار فٹ سفیدی کرنے کے لئے چونا اور ایک خوراک میگنیشیم اور باقی تیرہ گیلن پانی ہے۔ تو یہ ہے انسان کی اصلیت۔ مگر ذرا اس کی اکڑ فوں تو دیکھئے کائنات کے سارے سیاروں کو فتح کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے بھی سنا یا پڑھا ہو گا کہ انسان کو "سماجی حیوان" کہا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے سماجی ہی سہی، ہے تو جانور۔ اور پھر انسان ہی ایک ایسا

جانور ہے جو بے وقوف بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آپ نے کبھی "بیوقوف کتا" یا "احمق بلی" وغیرہ نہیں سنا ہو گا۔ اسی طرح ڈارون کے لفظوں میں "انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو شرمانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور جسے شرمانے کی ضرورت بھی ہے۔" آپ پوچھیں گے بھلا انسان کو شرمانے کی کیوں ضرورت ہے اس کی وجہ بھی سن لیجئے۔

مشہور امریکی فلسفی ولیم جیمس کا کہنا ہے کہ "انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو دوسرے تمام جانوروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طریقہ پر اپنی نسل کا شکار کر سکتا ہے۔"

اور پھر ذرا انسان کی عادتوں پر تو غور کیجئے۔ ضرورت سے زیادہ کھا کر ہاضمہ کے لئے چورن استعمال کرتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ بھوک گنوا بیٹھتا ہے۔ بھری دوپہر میں کمرے میں آنے والی روشنی کو پردے کھینچ کر اندھیرے میں بدلتا ہے، اور پھر بجلی کا بلب جلاتا ہے۔ اولاد کے لئے دعائیں مانگتا ہے اور پھر اسی سے بیزاری ظاہر کرتا ہے۔ پہلے گھوڑا بن کر بچوں کو اپنی کمر پر سواری کراتا ہے۔ اور جب وہ سر پر چڑھ جاتے ہیں، تو انہیں بدتمیز اور گستاخ کا خطاب دیتا ہے۔ پہلے بچوں کو چھیڑتا ہے۔ اور جب وہ چھڑ جاتے ہیں، تو ان کو "الو کا پٹھا" اور "گدھے کا بچہ" وغیرہ کہتا ہے۔ اور یہ بھول جاتا ہے۔ کہ دراصل وہ اس کے اپنے بچے ہیں۔

اگر آپ کو دیکھنا ہے کہ انسان کتنی دلچسپ شے ہے تو اس کو لڑتے جھگڑتے دیکھئے۔

"میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔ مگر آپ تو بڑے ............ نکلے"

"دیکھئے منہ سنبھال کر بات کیجئے۔"

"ورنہ؟"

"تمہارے دانت توڑ دوں گا۔"

"ارے جا بڑا آیا ہے دانت توڑنے والا۔"

"تیری ایسی کی تیسی۔"

یہ لیجئے آپ سے تو تک اترتے ہی آستینیں چڑھ گئیں۔ اور دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے اور جونہی کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا آیا دونوں نے دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کیا اور الگ ہو کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگے۔

واقعی انسان بھی کیا خوب شے ہے۔ فلم میں تو اداکاری کرتا ہی ہے عام زندگی میں بھی ایسی اداکاری کرتا ہے کہ اس کے سوا کسی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ یہ اداکاری ہے۔ مثلاً کسی ایسے رشتہ دار کی موت پر غم سے کپڑے پھاڑ لینا اور چیخنا پکارنا جس سے کچھ ترکہ میں ملنے والا ہو۔ یا کسی کی ترقی پر دل ہی دل

میں جل بھن کر کباب ہو جانا اور بظاہر اسے اس طرح گلے لگا لینا جیسے خود اس کی اپنی ترقی ہوئی ہو۔۔ یہ انسان کی اداکاری کی ایسی مثالیں ہیں جو ہم آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔

تمام مخلوقات میں انسان ہی ہے جو کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ ایک طرف ایک خدا کو مانتا ہے اور دوسری طرف سینکڑوں خدا تخلیق کر کے ان کے آگے سجدہ کرتا ہے۔ اور اب تو انسان نے خدا کی تلاش چھوڑ ہی دی ہے۔ شاید خود خدا کو تلاش ہو کہ وہ جو انسان اس نے تخلیق کیا تھا وہ کہاں گیا۔ عقل کی مدد سے انسان نے مذہب کو ایک پیشہ بنا لیا۔ جو آمدنی کے لحاظ سے اچھا خاصا منافع بخش ثابت ہوا۔ ایک دوسرا پیشہ ہے سیاست جس میں انسان "نہ" کبھی نہیں کرتا جھوٹ کو سچ بنانے میں سیاستدان کو ملکہ ہوتا ہے۔ اور وہ اپنا کام دوسروں سے اس طرح کراتا ہے کہ دوسرے اسے اپنا ہی کام سمجھیں۔

"حضرت انسان کی ایک اور دلچسپ عادت ہے کہ جو کام خود کرتا ہے دوسروں کو اس سے منع کرتا ہے۔

"کیا آپ نے صبح نو بجے اٹھ کر حقہ کی نے منہ میں دبائے کسی بزرگ کو اپنے بیٹے یا بھتیجے کو نصیحت کرتے نہیں سنا کہ۔"

"بیٹے صبح سویرے اٹھنا صحت کے لئے بہت مفید ہے۔"

کتنا رحمدل ہے انسان کہ تجربہ گاہ میں چیر پھاڑ کرنے سے پہلے مینڈک کو مارتا ہے پرندوں کا شکار کرتا ہے، بے ضرر حیوانات کو گولیوں کا نشانہ بناتا ہے اور ساتھ ہی "انجمن تحفظ حیوانات" کا ادارہ بھی بناتا ہے۔ کتنا دلچسپ ہے وہ کہ اپنے بھائی کا خون چوستا ہے۔ اور چیونٹیوں کو آٹا کھلاتا ہے۔ سچ کہا جس نے بھی کہا کہ انسانی برائیوں سے بلند ہو کر انسانی برائیوں کا تماشہ دیکھنا بہت دلچسپ ہوتا ہے۔

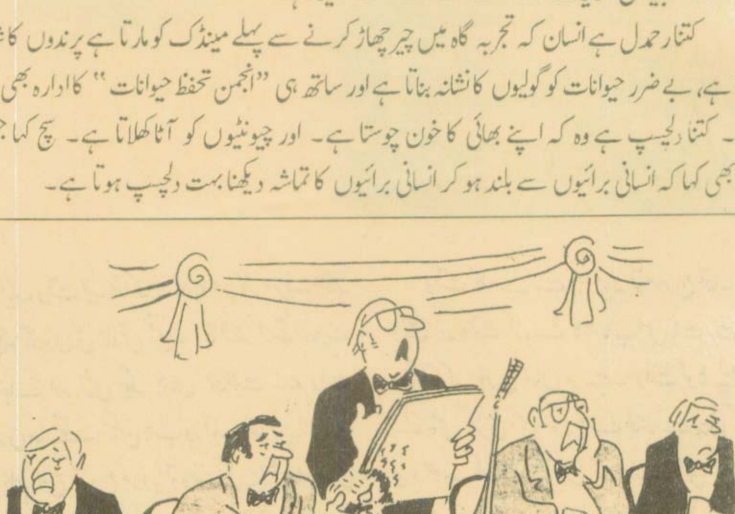

جب تقریر لمبی ہو جائے تو ۔۔۔۔۔۔۔

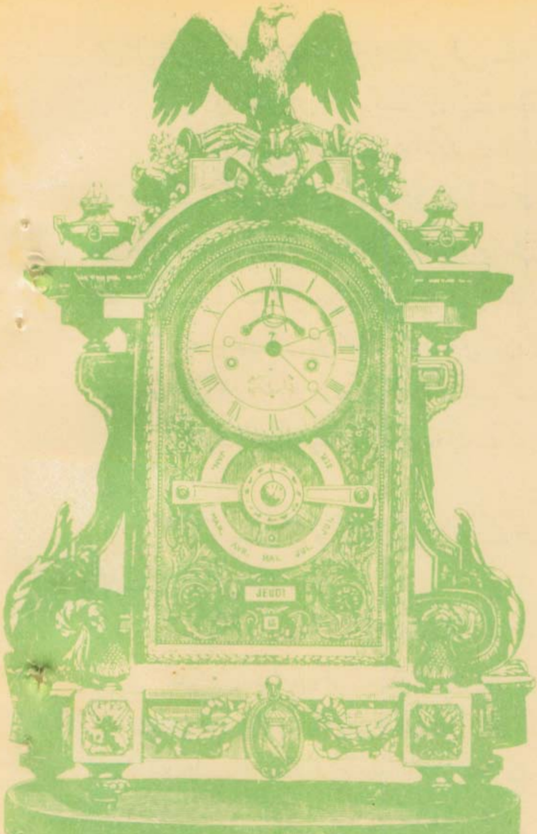

# چیزوں کی کہانی

آصف فرخی

## گھڑی

ایک وقت ایسا تھا کہ انسان کا سروکار صرف شکار اور پناہ گاہوں کی تلاش تھی۔ اتنا شکار کرسکے کہ پیٹ بھر جائے اور ایسی جگہ جہاں حفاظت سے رات گزاری جا سکے۔ لیکن جب وہ ایک مقام پر بس گیا اور کام کاج شروع کر دیا تو وقت کی پیمائش ضروری ہوگئی۔ وقت ، رات اور دن میں تو تقسیم تھا ہی، اب دن کو پہروں اور گھنٹوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔

وقت کا سب سے بڑا پیمانہ تو سورج تھا۔ دن ڈھلنے اور وقت گزرنے کا حساب اس بات سے رکھا جاتا تھا کہ سورج کہاں پر ہے۔ وقت کو ناپنے کے لئے پہلی گھڑی بھی سورج کے لحاظ سے بنائی گئی۔ یہ دھوپ گھڑی، گھنٹوں کا حساب رکھتی تھی اور سورج کے سائے کے لحاظ سے وقت بتاتی تھی۔

گھٹتے بڑھتے سائے کے حساب سے وقت بتانے والی دھوپ کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ رات کے

وقت یہ بے کار ہو جاتی تھی۔ جن دنوں، بادلوں کی وجہ سے سورج نہ دکھائی دیتا تو دھوپ گھڑی بھی رک جاتی۔ اس لئے لوگوں نے وقت کی پیائش کے اور طریقے ڈھونڈنے شروع کر دیئے۔

قدیم یونان اور روم میں آبی گھڑی بہت مقبول تھی۔ یہ گھڑی کیا تھی، ایک برتن تھا جس میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا اور سوراخ سے پانی نکلتا رہتا۔ پانی کے نکلتے رہنے سے برتن کے خالی ہو جانے کی مدت معلوم تھی۔ جب برتن خالی ہو جاتا تو معلوم ہوتا کہ اتنا وقت گزر چکا ہے۔

اس کے بعد شمع گھڑی کا رواج ہوا۔ یہ موم بتی تھی جس پر مختلف نشان لگے ہوتے تھے۔ ایک نشان سے دوسرے نشان تک شمع کے پگھلنے کا مطلب تھا کہ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ یعنی موم بتی کا جلنا اور پگھلنا، وقت کا گزرنا تھا۔

اس سے زیادہ سستا اور قابل اعتماد ذریعہ، ریت گھڑی تھی۔ یہ گھڑی شیشے کی ایک نلکی تھی جو درمیان سے اتنی پتلی تھی کہ دو حصوں میں بٹی ہوئی نظر آتی۔ اوپر کے حصے میں ریت بھری ہوئی تھی، جو نیچے گرتی رہتی۔ اوپر کے حصے کے بالکل خالی ہو کر نیچے کے حصے کے بھر جانے میں پورا گھنٹہ لگتا تھا۔ جب گھنٹہ پورا ہو جاتا، اور اوپر کی تمام ریت نیچے پہنچ جاتی، تو ریت گھڑی کو الٹا کر لیا جاتا، اور ریت کا گرنا دوبارہ شروع ہو جاتا۔

ریت گھڑی کا رواج اس وقت کم ہوا جب کل پرزوں کی بنی ہوئی گھڑیاں عام ہو گئیں۔

ایسی گھڑیوں کے عام ہونے میں بہت وقت لگا، اور ایک عرصے تک انہیں عجوبہ سمجھا جاتا رہا۔ خلیفہ ہارون رشید نے فرانس کے بادشاہ شاہ ولیمن کو تحفے میں بہت خوبصورت گھڑی بھیجی تو اس کا سارا دربار گھڑی کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

یورپ میں کل پرزوں کی گھڑی بارہویں صدی میں نمودار ہوئی۔ لوہاروں کی بنائی ہوئی یہ گھڑی کچھ ایسی ٹھیک نہیں تھی، مگر اس سے تھوڑا بہت کام لیا جانے لگا۔

۱۳۰۶ء میں اطالیہ کے شہر میلان میں پہلی مرتبہ گھنٹے کی ٹن ٹن سنائی دی تو اسے بڑا اہم واقعہ سمجھا گیا اس کا مطلب یہ تھا کہ اب محض سن کر لوگ یہ بتا سکتے ہیں کہ کیا وقت ہوا ہے۔

جلد ہی عوام کو سہولت کے لئے شہروں کے اہم مقامات پر بڑے بڑے گھنٹہ گھر تعمیر کئے گئے۔ بعض شہروں میں جو گھنٹہ گھر بنائے گئے وہ فن تعمیر کا بھی اور ماہرانہ کاری گری کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ ہر گھنٹے پر سپاہیوں کی قطار یا تاریخی ہستیوں کی شبیہ نکل کر بتاتی کہ گھنٹہ پورا ہو گیا ہے۔ لوگ انہیں دیکھتے اور وقت کا اندازہ لگا لیتے۔

لوگ اب بھی دور دور سے آکر ان گھنٹہ گھروں کو دیکھتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لئے نہیں کہ اب کیا وقت ہوا ہے، بلکہ ایک گزرے ہوئے وقت کے آثار کے طور پر۔

لوہاروں نے ابتداء میں جو گھڑیاں بنائی تھیں، وہ بڑی اور بھاری تھیں، اور پہیوں کے گرد گھومنے

والے وزن سے چلتی تھیں۔ ان کو بہتر بنانے کے لئے کام ہوتا رہا۔ بھاری وزن کے بجائے اسپرنگ استعمال ہوا تو گھڑی کا چھوٹا کرنا ممکن ہوگیا۔ پنڈولم لگائے گئے تو گھڑی کی رفتار بہتر ہوگئی، اور منٹ بتانے والی چھوٹی سوئی کے اضافے سے اب گھڑیاں، گھنٹوں کا حساب رکھنے کے بجائے منٹ، منٹ کا حساب رکھنے لگیں۔

گھنٹوں کے بجائے چھوٹی گھڑیاں بننے لگیں، اور ان کا سنبھالنا آسان ہوگیا تو ان کا استعمال بھی بڑھ گیا۔ اب ہر شخص چاہتا تھا کہ اس کے گھر کی دیوار پر ایک گھڑی ضرور لٹک رہی ہو۔ گھڑی سازی اہم کام بن گئی۔

پہلی باقاعدہ گھڑی، جرمنی کے ایک قفل ساز نے ۱۵۰۰ء کے لگ بھگ بنائی۔ یہ گھڑی بیضوی شکل کی تھی، اور گلے میں ہار کی طرح پہنی جاتی تھی یا کلر کے گرد لٹکائی جاتی تھی۔ اس گھڑی نے جلد ہی ایک زیور کی صورت اختیار کرلی۔ مشہور و معروف سنار اور دست کار ان گھڑیوں کو طرح طرح کے نمونوں میں بناتے اور سونے چاندی کے کام پر جواہرات جڑتے۔ یہ گھڑی کیا تھی، فن پارہ تھی، اور ایک گھڑی کا مالک ہونا بڑی بات تھی۔ جن لوگوں کی طبیعت میں دکھاوا ہوتا، وہ ایک ہی وقت میں کئی گھڑیاں پہنتے یہ گھڑیاں الگ الگ شکلوں کی ہوتی ہوں گی، مگر ان سب میں وقت ایک ہی سا ہوتا ہوگا۔

ایک گھڑی بنانے کے لئے ایک ماہر اور ہنر مند کاریگر کو بہت وقت درکار ہوتا تھا۔ پچھلی صدی میں صنعتی ترقی کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ اتنی قیمت کی گھڑیاں بننے لگیں کہ ایک آدمی کی دسترس میں ہوں گھڑی زیور کے بجائے ضرورت کی چیز بن گئی۔ مگر پھر بھی گھڑی بہت قیمتی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ سونے کی زنجیر سے لٹکی ہوئی، ڈبیا کی طرح کھلنے والی اور چابی سے چلنے والی جیبی گھڑیاں، اب سے تھوڑا عرصہ پہلے تک اعلیٰ لباس کا حصہ سمجھی جاتی تھیں۔

اب گھڑیاں جیبوں سے نکل کر کلائی پر آگئی ہیں۔ یعنی اب وقت ہماری ہاتھوں میں ہے۔

وقت کیا ہاتھ آیا، طرح طرح کی گھڑیاں سامنے آگئیں۔ بغیر چابی کے چلنے والی، اندھیرے میں چمکنے والی، پانی سے خراب نہ ہونے والی اور چوٹ سہار جانے والی گھڑیاں اب عام ہیں آج کی گھڑیاں دیکھنے میں سبک بھی نظر آتی ہیں، اور وقت کی پیمائش میں اتنی حساس ہیں کہ سیکنڈ کے حصے کا بھی حساب رکھتی ہیں۔

دھوپ گھڑی سے ۔ لے کر کلائی کی گھڑی، تک آتے میں بہت وقت لگا ہے۔

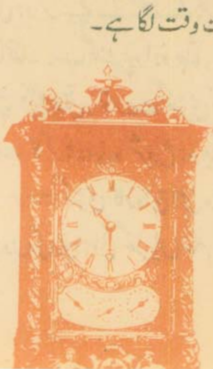

# موچی کا بیٹا

ریاض جاوید

یکم دسمبر ۱۸۱۹ء کے روز، ڈنمارک کے ایک معمولی سے قصبے اوڈنسے (ODENSE) سے ایک چودہ سالہ لڑکا اپنا نام پیدا کرنے کیلئے اپنے ملک کے دارالحکومت کوپن ہیگن روانہ ہوا۔ یہ لڑکا طویل قامت اور انتہائی دبلا پتلا تھا۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ عجیب سا لڑکا پرلے درجے کا احمق بھی ہے۔

یہ لڑکا اوڈنسے کے ایک موچی کا بیٹا تھا۔ باپ کا سایہ تقریباً دو سال ہوئے سر سے اٹھ چکا تھا۔ اس کی بیوہ ماں بمشکل اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پال سکتی تھی۔ ماں کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا درزی بنے لیکن اس کے سر میں ایسا سودا سمایا کہ وہ چھوٹے سے قصبہ کو خیرباد کہہ کر اپنی قسمت آزمائی کیلئے کوپن ہیگن جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اپنے مرحوم والد کے کوٹ کو چھوٹا کرواکر، اور ایک پوٹلی بغل میں داب کر کوپن ہیگن روانہ ہوا۔ راستہ میں دارالحکومت کو جاتی ہوئی ایک گھوڑا گاڑی کے کوچبان کو اس پر ترس آگیا اور اس نے اسے

گاڑی میں جگہ دے دی۔

۶ دسمبر ۱۸۱۹ء کو اسے فیڈر کز برگ پر اتار دیا گیا۔ کیونکہ وہ گاڑی کا کرایہ ادا کئے بغیر کوپن ہیگن کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں سے وہ پیدل چل کر کوپن ہیگن پہنچا۔ اپنے وطن کے دارالحکومت کے سربفلک مینار دیکھ کر اس کا اوّلین ردِّعمل یہ تھا کہ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ یہ آنسو اس کی زندگی کے ہر دور میں مختلف مواقع پر بہتے رہے۔ خوشی اور رنج میں اسے اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رہتا تھا۔

اس معمولی موچی کے بیٹے کا نام ہانز کرسچین اینڈرسن تھا۔ جو شہرت کمانے کیلئے ملک کے مرکزی شہر میں وارد ہوا۔ اس کا سرمایہ "مضبوط ارادہ اور بلند ترین حوصلہ" تھا۔ البتہ یہ درست ہے کہ اس کی پوٹلی میں کئی ایسی چیزیں تھیں جن سے وقت آنے پر کوپن ہیگن کا دل اور اس کے دروازے اس پر کھل گئے۔

۱۸ دسمبر ۱۸۱۹ء کو وہ کوپن ہیگن کے مشہور موسیقار سیونی (SIBONI) کے دروازے پر کھڑا تھا۔ موسیقار کی خادمہ کو اس نے اپنی سرگزشت سنائی۔ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بتایا کہ وہ ایک موچی کا بیٹا ہے اور اوڈنسے سے اس غرض سے آیا ہے کہ اسے تھیٹر میں بحیثیت اداکار ملازمت مل جائے۔ اس وقت اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں تھی بلکہ دو روز سے اس کے منہ میں ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا۔ اینڈرسن دروازے پر کھڑا اپنی یہ آپ بیتی سنا رہا تھا اور اندر موسیقار اپنے دوست شاعر اور ڈرامہ نویس کی دعوت میں مصروف تھا۔ خادمہ نے آکر کہا کہ دروازے پر ایک غریب لڑکا کھڑا ہے وہ اداکار بننے کیلئے بڑی دور سے آیا ہے۔ دوستوں نے خادمہ سے کہا "اسے اندر بلاؤ۔ چند منٹ دل لگی ہی رہے گی۔" اینڈرسن کو ان کے سامنے حاضر کیا گیا اور جب اسے مکالمہ کی ادائیگی کیلئے کہا گیا تو دیکھتے ہی دیکھتے دوستوں کا مذاق جذبۂ رحم میں بدل گیا۔ اور اس کی مدد کرنے کا اظہار کیا گیا۔ یوں اینڈرسن نے شہر میں اپنی آمد کے تقریباً گیارہ روز بعد پہلا معرکہ سر کر لیا۔ اس کے سامنے جدوجہد کا ایک زبردست سلسلہ تھا۔ تاہم اس نے کوپن ہیگن میں اپنے لئے جگہ بنالی۔

اس نے اداکار بننے کی کوشش کی، اسے کوپن ہیگن کے شاہی تھیٹر میں مدد دی گئی لیکن وہ مکمل طور پر ناکام رہا۔ اسے رقاص بننے کا شوق چرایا، لیکن اس کی کمزور ٹانگیں اس کا ساتھ نہ دے سکیں۔ اس نے گوّیا بننے کی کوشش کی، لیکن اس کی آواز پہلی ہی تان پر پھٹ جاتی۔ بالآخر اس نے اپنا ایک ڈرامہ تھیٹر کے ڈائریکٹروں کو منظوری کیلئے پیش کیا۔ ڈائریکٹروں نے اس ڈرامہ پر لکھا:-

"ہم ایسی بکواس کوشش کو اسٹیج پر دیکھنا نہیں چاہتے"۔

اس زمانے میں ڈرامے نظموں کے انداز میں لکھے جاتے تھے۔ اینڈرسن کا منظوم ڈرامہ اِملا کی غلطیوں سے پُر تھا۔ اور یہ کسی ایسے آدمی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا جس نے باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کی ہو۔

بہرحال اس عرصہ میں اینڈرسن اپنی سادگی اور ہمت کی بنا پر کوپن ہیگن کے ادبی حلقوں اور بااثر افراد سے روشناس ہوچکا تھا۔ وہ لوگ اس نوعمر لڑکے کی مدد کرنا چاہتے تھے جو اپنے آپ کو شاعر اور ڈرامہ نویس کہتا تھا مگر جو نہ صرف ادبی روایات سے بے خبر تھا، بلکہ اس کی ابتدائی تعلیم بھی ادھوری تھی۔

رائل تھیٹر کے ڈائریکٹر جوناس کولین کی خواہش پر اینڈرسن کو سلگلسیے باقاعدہ تعلیم کیلئے بھیج دیا گیا۔ اس طرح اینڈرسن سترہ سال کی عمر میں اسکول میں داخل ہوا۔ اسے اپنی عمر سے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ پڑھنا پڑا۔ جہاں اس نے اپنی خوفناک جہالت کا اعتراف کیا۔ وہ شعر تو کہہ سکتا تھا لیکن نقشہ پر کوپن ہیگن نہیں بتا سکتا تھا۔

زمانۂ تعلیم میں اس کا اتالیق میزلنگ (MEISLING) مقرر ہوا جو اپنی سخت مزاجی اور کڑے ضبط و نظم کی بنا پر طلبا میں ایک دہشت تھا۔ اینڈرسن میزلنگ کی کڑی نگرانی میں محنتی اور ذہین طالب علم ثابت ہوا۔ مگر تندمزاج استاد اس کی ذہانت کا معترف ہوتے ہوئے بھی اس سے نرمی کا برتاؤ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نیک نیتی سے سوچتا تھا کہ اگر اینڈرسن سے نرمی اور پیار سے پیش آیا گیا تو اس کے ذہن میں اپنی بڑائی کا غلط وہم سما جائے گا۔ کیونکہ اس عرصہ میں اینڈرسن کے چند گیت ادبی رسالوں میں شائع ہوچکے تھے۔

۱۸۲۸ء میں اینڈرسن نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کی زندگی کا یہ پہلا اور آخری امتحان تھا۔ پھر اس کے بعد ہی اس کے لکھے ہوئے سفرنامے، نظمیں، اوپرانامے، ڈرامے اور ناول یکے بعد دیگرے منظرعام پر آتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد شاہ ڈنمارک نے اس کا سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔

۱۸۳۵ء میں اس نے بحیثیت ناول نگار شہرت حاصل کی۔ اس کے پہلے ناول کا ترجمہ فوراً جرمن میں کیا گیا اور اشاعت کے دس سال بعد اس کا انگریزی ترجمہ ہوا۔ ان تراجم سے وہ تمام مغربی یورپ میں مقبول ہوگیا لیکن اب تک اسے ایک کامیاب ڈرامہ نگار کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

بلآخر اینڈرسن کا ایک ڈرامہ کامیاب ہوا۔ اس موقع پر وہ ڈرامہ کے پہلے شو سے اٹھ کر تھیٹر کے پاس اپنے محسن جوناس کولین کے مکان میں چلا گیا۔ بیگم جوناس کولین گھر میں تنہا تھیں انہوں نے اینڈرسن کو دیکھا کہ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے، وہ سمجھیں کہ اینڈرسن کا ڈرامہ ناکام رہا ہے۔ اس نیک دل خاتون نے ان کی ڈھارس بندھانے کے لئے کہا کہ بعض اوقات کہنہ مشق ادیبوں کے ڈرامے بھی تماشائیوں کے مذاق اور شور کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس پر اینڈرسن نے ہچکیوں کے درمیان کہا ”لیکن انہوں نے شور

نہیں مچایا، اور نہ ہی سیٹیاں بجائیں انہوں نے تو نعرے لگائے کہ مصنف زندہ باد "۔

اینڈرسن زندگی کے آخری ایّام میں بھی چودہ سال کا لڑکا رہا جو کوپن ہیگن کے بلند مینار دیکھ کر جذبات سے مغلوب رو دیا تھا۔ اس کی سادہ لوحی نے اسے کبھی بھی دنیا دار قسم کا انسان نہیں بنایا حالانکہ وہ اپنے زمانہ کی مشہور شخصیتوں سے مل چکا تھا۔ بادشاہ، فنکار، سائنس داں، سیاستداں سب سے، لیکن اس کی فطری سادگی میں فرق نہیں آیا۔

۱۸۳۵ء میں اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ اینڈرسن بھی ابتدا میں ان کہانیوں کی اہمیت کو نہ جان سکا اور کہانیوں کے سرورق پر "بچوں کیلئے" الفاظ تحریر تھے۔ لیکن یہ کہانیاں جلد ہی بچوں کے علاوہ سنجیدہ لوگوں اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز بن گئیں اور ایک مشہور تنقید نگار نے پیش گوئی کرتے ہوئے لکھا کہ ہانز اینڈرسن کی ابدی شہرت کا راستہ یہ کہانیاں ہیں۔ چنانچہ ڈنمارک میں ایسی کہانیوں کی دیگر جلدوں سے "بچوں کیلئے" کے الفاظ حذف کر دیئے گئے۔

اینڈرسن نے اپنے آپ کو "دلدل کا پودا" سے تشبیہ دی تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس "پودے" کی عظمت بڑھتی گئی۔ آج اس کی کہانیاں دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہیں۔ آنکھ مچولی کے اس شمارے میں ہانز کرسچین اینڈرسن کی ایک کہانی شائع کی جارہی ہے اور انشاء اللہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

## خدا کی پناہ

ایک صاحب اپنے دفتر کے نئے ساتھی کو بتا رہے تھے۔

"دس سال تک میرے معمولات گھڑی کی طرح ایک ہی دائرے میں رہے۔ روزانہ صبح چھ بجے اٹھنا، آدھے گھنٹے بعد ناشتہ کرنا، آٹھ بجے سے شام چھ بجے تک کام کرنا، ساڑھے سات بجے رات کا کھانا کھالینا، ساڑھے نو بجے سو جانا، صرف سادہ غذا کھانا، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ میں دس سال میں ایک بار بھی بیمار نہیں پڑا۔"

ساتھی بولا "خدا کی پناہ آپ کس جرم کی پاداش میں دس سال کے لئے اندر ہوئے تھے۔"

# ماں کی کہانی

ھانز کرسچن اینڈرسن
ترجمہ : ریاض جاوید

ماں اپنے بچے کو بڑے خوف اور افسوس سے دیکھ رہی تھی۔ بچے کی موت کے تصور ہی سے وہ کانپ رہی تھی۔ بچے کا رنگ زرد تھا، اس کی آنکھیں بند اور سانس اکھڑا ہوا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ ایک آہ کھینچتا تھا۔ ماں اس ننھی جان کو اس حالت میں دیکھ رہی تھی اور ساتھ ہی اس کا اپنا چہرہ دکھ سے زرد ہوتا جا رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ایک ضعیف شخص اندر داخل ہوا۔ جس نے اپنے گرد ایک بوریا لپیٹ رکھا تھا۔ سخت سردی کا موسم تھا۔ مکان کے باہر برف جمی ہوئی تھی اور جسم کو یخ بستہ کر دینے والی سرد آندھی چل رہی تھی۔ اس ضعیف آدمی کو گرم لباس کی ضرورت تھی۔

سردی سے کانپتے ہوئے آدمی کی طرف ماں نے دیکھا اور پھر اپنے ننھے کی طرف دیکھنے لگی۔ بچے کی

آنکھ لگ چکی تھی۔ وہ اٹھی اور مہمان کے لئے چھوٹے سے برتن میں سوپ ڈال کر گرم کرنے لگی اس دوران میں وہ بوڑھا ننھے کا پنگھوڑا آہستہ آہستہ ہلاتا رہا۔ ماں نے گرم سوپ کا گلاس مہمان کو دیا اور پھر بچے کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے بیمار بچے کے ننھے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں۔ لے کر اس کے اکھڑے ہوئے سانس کو سننے لگی۔

"یہ میرے پاس ہی رہے گا نا...... آپ کا کیا خیال ہے؟" ماں نے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا۔ "خدا کرم کرنے والا ہے۔ وہ میری جان کے ٹکڑے کو مجھ سے نہیں چھینے گا۔"

یہ سن کر اس بوڑھے نے اپنا سر اس طرح جھکایا کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے اس کا مطلب ہاں تھا یا نہیں...... ماں نے اپنی نگاہیں نیچے جھکالیں اور اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ یک لخت اس نے اپنا سر بھاری ہوتا محسوس کیا۔ کیونکہ وہ پورے تین دن اور تین راتیں سو نہ سکی تھی اور اب ایک لمحہ کے لئے وہ اونگھ گئی اور دوسرے لمحے سردی سے کانپتے ہوئے، اس کی آنکھ کھل گئی۔

یہ کیا ہوا؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بوڑھا جاچکا تھا اور اس کا ننھا بھی غائب تھا۔ کمرے کے کونے میں ایک پرانا کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا اور اس کے علاوہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کلاک کا پنڈولم آہستہ آہستہ دائیں سے بائیں حرکت کر رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ فرش پر آرہا اور اس طرح کلاک بھی خاموش ہو گیا۔

بد نصیب ماں اپنے بچے کو پکارتے ہوئے مکان کے باہر بھاگ نکلی۔ باہر برف کے ٹیلے پر سیاہ لباس میں ایک عورت بیٹھی تھی۔ ماں کو دیکھ کر وہ بولی "موت تمہارے گھر سے ابھی ابھی نکلا ہے (مصنف نے موت کے کردار کو مذکر لکھا ہے تسلسل کے لئے مجھے بھی مذکر لکھنا پڑا۔ مترجم) اس کی گود میں تمہارا بچہ تھا۔ وہ آندھی سے بھی تیز بھاگتا ہے اور وہ جو لے جاتا ہے، کبھی واپس نہیں کرتا۔"

"مجھ صرف یہ بتا دیجئے کہ وہ کس راستہ سے گیا ہے؟" ماں نے التجا کی۔ "مجھے راستہ دکھا دیجئے۔ میں اسے تلاش کر لوں گی۔"

"میں راستہ تو جانتی ہوں۔" سیاہ لباس والی عورت نے جواب دیا۔ "مگر راستہ بتانے سے پہلے میں وہ سب گیت اور لوریاں سننا چاہتی ہوں، جو تم اپنے ننھے کو سناتی تھیں میں رات ہوں اور مجھے تمہارے گیت بہت پسند ہیں۔ میں کئی بار تمہارے گیت سن چکی ہوں اور انہیں گاتے ہوئے تمہارے پلکوں سے گرتے ہوئے آنسو بھی گنتی رہی ہوں۔"

"میں آپ کو کل گیت سناؤں گی۔ مگر اس وقت مجھے مت روکیئے۔ مجھے موت کے پیچھے جانے دیجئے مجھے میرا ننھا بچہ بچانے دیجئے۔" ماں نے رقت انگیز لہجہ میں کہا۔

مگر رات نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی یہ دیکھ کر ماں نے روتے ہوئے اور اپنے ہاتھ ملتے ہوئے، گیت سنانے شروع کئے اس نے کئی گیت سنائے مگر ان سے کہیں زیادہ اس نے آنسو بہائے۔

آخر رات بولی۔ "دائیں طرف جاؤ۔ موت تمہارے بچے کو شیشم کے جھنڈ کی طرف لے گیا ہے!"

ماں جب جھنڈ میں پہنچی، تو اس نے دیکھا کہ وہاں کئی راستے نکلتے تھے بے چاری کے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کونسا راستہ اختیار کرے۔ اسی جگہ ایک کانٹے دار پودا تھا۔ جس پر پتے نام کو نہ تھے۔ چونکہ سردی کا موسم تھا اس لئے اس کی ننگی شاخوں پر برف کے چھوٹے چھوٹے گالے پڑے تھے۔

"ہائے۔ مجھے بتاؤ۔ کیا تم نے موت کو میرا ننھا بچہ لے جاتے تو نہیں دیکھا؟"

"ہاں میں نے دیکھا ہے۔" کانٹے دار پودے نے جواب دیا۔ مگر میں تمہیں راستہ نہیں بتاؤں گا۔ جب تک کہ تم مجھے اپنی چھاتی سے بھینچ کر گرم نہ کرو گی۔ کیونکہ میں سردی سے مر رہا ہوں۔ میں برف بنتا جا رہا ہوں۔"

ماں نے اس کانٹے دار پودے کو اتنے زور سے اپنی چھاتی سے چمٹایا کہ برف کے گالے پانی ہو گئے اور کانٹے ماں کی چھاتی میں پیوست ہو گئے اور خون کے موٹے موٹے قطرے بہنے لگے اور اس انتہائی سرد رات کو اس کانٹے دار پودے پر ہرے ہرے پتے اور سرخ پھول پیدا ہو گئے۔ ماں کا دل اتنا گرم ہوتا ہے کہ تب اس پودے نے ماں کو راستہ بتایا!

یہ راستہ ایک بڑی لمبی چوڑی جھیل پر ختم ہوتا تھا جھیل کے کنارے کوئی جہاز یا کشتی نہ تھی۔ پانی اتنا جم نہیں چکا تھا کہ وہ ماں کا وزن برداشت کر تا تاہم اپنے بچے کو واپس لینے کے لئے ماں کو یہ جھیل عبور کرنی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ وہ جھیل کے تمام پانی کو پی لے گی وہ اس کے کنارے لیٹ گئی حالانکہ انسان کے لئے ایسا کرنا ممکن ہی نہیں مگر پھر بھی دکھی ماں کو یقین تھا کہ شاید اس طرح کوئی معجزہ ہی رونما ہو جائے۔

"نہیں نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔" جھیل نے کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ ہم آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیں۔ میں موتی جمع کرنے کی بڑی شائق ہوں اور تمہاری آنکھوں جیسے روشن موتی میں نے کبھی نہیں دیکھے اگر تم یہ آنکھیں مجھے دے دو تو میں تمہیں موت کے علاقہ میں پہنچا دوں گی۔ جہاں وہ ہر انسانی زندگی کے درخت کی رکھوالی کرتا ہے۔"

"آہ، میں اپنے بچے کو واپس لینے کے لئے کیا نہیں کر سکتی۔" ماں نے روتے ہوئے کہا اور

روتے روتے ماں کی آنکھیں دو چمکدار موتی بن کر گر پڑیں۔ پھر جھیل نے ماں کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ اور اسے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا جہاں موت کا میلوں لمبا مکان تھا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا، کہ وہ صحیح معنوں میں مکان تھا یا نہیں کیونکہ وہ ایک ایسی چار دیواری تھی جس میں ہر طرف درخت ہی درخت اور پھول ہی پھول تھے۔ مگر بے چاری ماں تو یہ دیکھ ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ اپنی آنکھیں جھیل کو دے چکی تھی۔

"اب موت کہاں ملے گا؟ مجھے اپنا ننھا واپس لینا ہے۔" ماں نے بلند آواز سے کہا۔

"وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔" تنکوں کی مانند بالوں والی عورت نے جواب دیا جو موت کے مکان کے باہر ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ موت اسے اپنے مکان کی حفاظت کے لئے چھوڑ گیا تھا۔

"تمہیں یہاں کا راستہ کیسے معلوم ہوا کس نے تمہاری مدد کی؟"

"خدا نے میری مدد کی ہے۔ جو مہربانوں کا مہربان ہے...... آپ بھی مجھ پر رحم کریں گی...... میرا بچہ کہاں ہے؟" ماں نے روتے ہوئے کہا۔

"میں یہ تو نہیں جانتی اور تم......اوہ میں سمجھی!! تم تو دیکھ ہی نہیں سکتیں۔آج رات کئی پودے اور پھول مرجھا چکے ہیں انہیں اکھیڑنے موت آتا ہی ہوگا تمہیں معلوم ہے کہ ہر انسان کی زندگی کا پھول یا پودا یہاں پیدا ہوتا ہے اور ان کے اندر انسان کی مانند دل متحرک رہتے ہیں۔ شاید تم اپنے بچے کے دل کی دھڑکن پہچان سکو...... مگر اس کے عوض تم مجھے کیا دو گی؟ اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اس کے بعد کیا کرنا چاہئے۔" اس بڑھیا نے کہا۔

"میرے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں۔" دکھی ماں نے کہا۔ "مگر میں آپ کے حکم کی تعمیل میں دنیا کے دوسرے کنارے تک بھی جا سکتی ہوں۔"

"مجھے دنیا کے آخری کنارے سے کیا لینا ہے؟" بڑھیا نے جواب دیا۔ "البتہ تم مجھے اپنے لمبے اور سیاہ بال دے دو۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے بال کتنے پیارے ہیں، مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں، ان کے عوض تم مجھ سے میرے سفید بال لے سکتی ہو۔ نہ ہونے سے تو یہ بہتر ہی رہیں گے۔"

"آپ نے تو کچھ بھی نہیں مانگا۔" ماں نے جواب دیا۔ "میں اپنے بال بڑی خوشی سے دیتی ہوں۔"

اور ماں نے اپنے خوبصورت سیاہ بال دے کر بڑھیا کے تنکوں کی مانند سفید بال لے لئے۔ پھر دونوں موت کی وسیع چار دیواری میں داخل ہوئیں۔ جہاں مختلف اقسام کے درخت اور پودے کمال قرینے سے کھڑے تھے سنبل کے پھول تھے، جنہیں شیشے کے خولوں میں ڈھکا ہوا تھا۔ نرگس کے پھول تھے جن

میں کچھ تو صحت مند اور کچھ بیمار معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کے ڈنٹھلوں پر آبی سانپ چمٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف پام، شیشم اور کھجور کے شاندار اور بلند درخت تھے اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے پودے نہایت انکساری سے اپنی خوشبو بکھیر رہے تھے۔

ایسا کوئی پودا اور ایسا کوئی پھول نہ تھا، جس کا نام نہ ہو جن لوگوں کے نام ان پر لکھے ہوئے تھے وہ دنیا کی ہر قوم سے تعلق رکھتے تھے اور روئے زمین کے ہر خطے میں بستے تھے اگر ایک چین کا تھا، تو دوسرا گرین لینڈ کا تھا...... اس طرح ہر ملک کے باشندوں کے نام موجود تھے۔

چند بڑے بڑے تنومند درخت چھوٹے چھوٹے گملوں میں اُگے ہوئے تھے۔ جہاں ان کی جڑیں گملوں کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھیں اِن کے برعکس کمزور اور ننھی ننھی بوٹیاں زرخیز زمین کے ٹیلے پر اگی ہوئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی خاص حفاظت کی جاتی ہے۔

دکھی ماں ہر ننھے پودے پر جھکتی۔ اس کے دل کی دھڑکن سنتی۔ اور لاکھوں پھولوں میں اس نے اپنے بچے کے دل کی دھڑکن پہچان لی۔

"یہ ہے۔" وہ بے اختیار چیخ پڑی اور اس نے اپنا ہاتھ کے پھول کی طرف بڑھایا، جو کمزور اور کملایا ہوا ایک طرف جھکا ہوا تھا۔

"نہ نہ پھول کو مت ہاتھ لگاؤ......" بڑھیا نے جلدی سے کہا۔ "ہاں تم یہاں کھڑی موت کا انتظار کرتی رہو جب وہ آئے ...... اور میرا خیال ہے کہ وہ بس آتا ہی ہو گا...... تو اسے یہ پھول توڑنے نہ دینا۔ اگر وہ نہ مانے تو دوسرے پھولوں کو توڑنے کی دھمکی دینا۔ اس سے وہ خوفزدہ ہو گا کیونکہ ہر پھول کے لئے اسے ہم سب کے مالک کو جواب دینا ہوتا ہے اور خدا کی اجازت کے بغیر کوئی پودا اکھاڑا نہیں جاسکتا۔"

اچانک ہوا کا ایک یخ جھونکا آیا اور اندھی ماں نے یہ محسوس کر لیا کہ موت آگیا ہے۔

"تمہیں یہاں کا راستہ کیسے معلوم ہوا، اور تم مجھ سے پہلے کیسے پہنچ گئی ہو؟" موت نے پوچھا۔

"میں ایک ماں ہوں۔" دکھی ماں نے صرف یہی کہا۔

موت نے اپنا طویل اور سوکھا ہوا ہاتھ ننھے سے نازک کاسنی پھول کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ماں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کا پھول کے گرد حلقہ بنا دیا۔ اور اپنے ہاتھوں کو آپس میں اتنے زور سے جکڑا، کہ اسے خود محسوس ہونے لگا کہ کہیں بے اختیاری میں پھول کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے یہ دیکھ کر موت نے اس کے ہاتھوں پر پھونک مار دی۔ ماں کو یہ پھونک موسم سرما کی برفیلی ہوا سے بھی سرد معلوم ہوئی اور اس

کے ہاتھ خود بخود نیچے گر گئے۔

"میرے مقابلہ میں تمہاری کوئی طاقت نہیں۔" موت نے کہا۔

"مگر ہمارا خدا تو ہے...... اور وہ رحم بھی کرنے والا ہے۔" ماں نے بے چارگی سے جواب دیا۔

"میں اس کے حکم کا بندہ ہوں۔" موت نے جواب دیا۔ "میں اس کا باغبان ہوں میں اس کے حکم ہی سے یہ تمام پھول باری باری توڑ کر نورانی باغوں میں لے جاتا ہوں جو تمہارے لئے نامعلوم دنیا ہے۔ وہاں کیا ہے؟ اور یہ پھول وہاں کیسے رہتے ہیں؟ یہ بتانے کی میں جرأت ہی نہیں کر سکتا!"

"ہائے میرا بچہ مجھے واپس دے دو۔" ماں نے روتے ہوئے کہا اور موت کی منت سماجت کرنے لگی۔ جب اس کا اثر موت پر نہ ہوا، تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دو خوب صورت پھول پکڑ لئے اور کہنے لگی۔

"میں تمام پھول توڑ دوں گی۔ میں بے بس ہو گئی ہوں!"

"انہیں ہاتھ مت لگاؤ" موت نے گرج دار آواز میں حکم دیا۔ "تم کہتی ہو کہ میں بہت ہی دکھی ہوں لیکن کیا تم اپنی طرح کسی اور ماں کو دکھی کرنا چاہتی ہو؟"

"کوئی اور ماں۔" ماں نے کہا اور دونوں پھولوں کو چھوڑ دیا۔

"لو! یہ تمہاری آنکھیں ہیں۔" موت نے کہا۔ "مجھے یہ جھیل سے ملی ہیں مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہاری آنکھیں ہوں گی لو انہیں واپس لے لو۔ اب یہ پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہو گئی ہیں اس گہرے کنوئیں میں جھانکو میں ان دونوں پھولوں کے نام بتاتا ہوں جن کو تم ابھی ابھی توڑنے لگی تھیں ان کی پوری زندگی اور ان کے مستقبل کی تصویریں دیکھو، جن کی زندگی کو تم ابھی ابھی تباہ کرنے لگی تھیں۔"

ماں کنویں میں جھانکنے لگی۔ اس نے ایک شاندار منظر دیکھا دونوں میں سے ایک پھول کی زندگی تمام دنیا کے لئے باعثِ رحمت تھی۔ اس کے گرد نور اور سکون کا ایک ہیولہ تھا۔ اس کے بعد یہ منظر بدل گیا اور پھر اس نے دیکھا کہ دوسرے پھول کی زندگی گناہ، دکھ، افسوس اور انتہائی بے بسی میں بسر ہو رہی ہے۔

"یہ دونوں خدا کی منشا ہیں۔" موت نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے یہ بتا دیجئے کہ ان دونوں میں سے کونسا پھول خوش قسمت ہے جس کی زندگی دنیا کے لئے باعث رحمت ہے اور وہ کونسا بدبخت ہے جس کی زندگی عذاب ہے؟" ماں نے التجا کی۔

"میں یہ تو نہیں بتا سکتا" موت نے جواب دیا "البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ ان دونوں میں سے ایک

پھول تمہارا بچہ ہے اور تم اپنے بچے کی تقدیر اور مستقبل دیکھ چکی ہو!"

یہ سن کر ماں خوف سے پیچھے ہٹ گئی۔

"ان میں میرا بچہ کون ہے؟ خدا کے لئے مجھے یہ تو بتا دیجئے...... میرے معصوم بچے کو اس دکھ اور عذاب والی زندگی سے چھٹکارا ملنا چاہئے...... مجھے اپنا بچہ نہیں چاہئے اسے خدا کی سلطنت میں لے جایئے اور بھول جایئے میرے آنسو...... بھول جایئے میری التجائیں اور بھول جایئے جو کچھ میں نے کیا ہے۔" ماں نے زار و قطار آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں سمجھ نہیں سکا۔" موت نے جواب دیا۔ "کیا تم اپنا بچہ لینا چاہتی ہو یا میں اسے اس جہاں میں لے جاؤں جس کے متعلق تم کچھ بھی نہیں جانتی۔"

ماں ہاتھ جوڑتے ہوئے اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑی اور عاقلوں کے عاقل اور سب سے بڑے رحم کرنے والے خدا کے حضور میں گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگنے لگی۔

"میں نے تیری مرضی کے خلاف التجائیں کیں میری ایسی التجائیں مت سُن۔ تیری مرضی ہی ہمیشہ میرے لئے بہتر ہوتی ہے مجھے معاف کر دے مجھے معاف کر دے......" اور ماں کا سر اس کی چھاتی پر جھک گیا۔ اور موت اس کا بچہ لے کر نامعلوم دنیا کو چلا گیا۔

# منہ نہ بنائیے
# سبزیاں بھی کھائیے

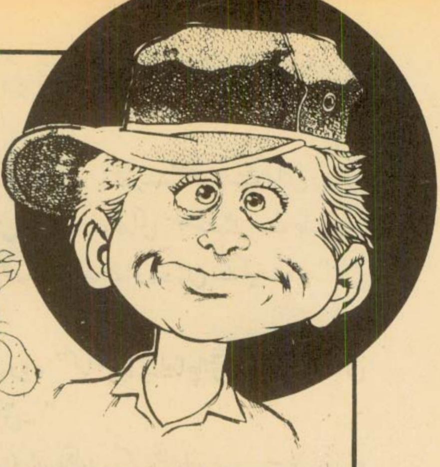

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے ۔

گوشت، انڈے، دودھ دہی ، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ـــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

★ ـــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں

★ ـــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے

★ ـــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں

یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔

★ ـــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں

★ ـــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے　　سبزیاں شوق سے کھائیے　　ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبودِ اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

# ماسٹر جی سے شکوہ

محمد صدیق فاروقی

یوں فیل جو کرنا تھا تو پہلے سے بتا دیتے
کوشش تو بہت کی تھی ناکام ہوئے آخر
پرچے جو ملے ہم کو سب کورے دیئے ہم نے
جو فیل کیا ہم کو یہ بات ہے معمولی
روتا ہوا چہرہ گر تم کو نہیں بھاتا ہے

ہم ساری کتابوں کو چولہے میں جلا دیتے
"ہاں پاس بھی ہو جاتے جو نقل کرادیتے"
اے کاش صفائی کے نمبر ہی دِلا دیتے
اتنے ہی جو قابل تھے تو پاس کرادیتے
نمبر ہی بڑھا دیتے ہم ہنس کے دکھا دیتے

## جوابِ شکوہ

یوں فیل جو ہونا تھا پہلے ہی بتا دیتے
کوشش تو بہت کی تھی ناکام ہوئے پھر بھی
پرچے جو ملے تم کو سب کورے دیئے تم نے
جو فیل کیا ہم نے یہ بات ہے معمولی
چُنّوں میاں رونے سے حاصل نہیں ہوتا کچھ

ابا سے کہا ہوتا ٹھیلہ وہ لگا دیتے
ہاں پاس کرادیتے جو عقل لڑا لیتے
اے کاش سیاہی کے دھبے ہی بنا دیتے
یہ بات ہے معمولی رٹا ہی لگا لیتے
تقدیر کے لکھے کو پہلے ہی مٹا لیتے

# جوڑے بنائیے

بکھری ہوئی ان ۱۴ چیزوں کے ۷ جوڑے بنائیے

# فنگر پرنٹس

م ، الف راشد

ولسن نے دو قتل کئے تھے مگر ثبوت اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے چالاک وکیل نے مقدمہ جیت لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جج اس کے حق میں فیصلہ سنانے والا تھا کہ اسی دوران ایک پولیس انسپکٹر نے جج کو ایک ثبوت فراہم کیا۔ اب جج کا فیصلہ یکسر بدل سکتا تھا۔ کیوں کہ یہ ایک ایسا ثبوت تھا جو ولسن کو قاتل ثابت کر رہا تھا۔ یہ اس کے فنگر پرنٹس تھے جو جائے واردات سے لئے گئے تھے۔

ایسی یا اس سے ملتی جلتی سچویشن کے بارے میں آپ نے اکثر جاسوسی ناولوں میں پڑھا ہوگا۔ یہ فنگر پرنٹس کیا ہوتے ہیں اور ان کی مدد سے کیسے کسی کی شناخت ہو سکتی ہے، آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

قدرت کی کاریگری کا اندازہ کیجئے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک جتنے بھی انسان پیدا ہوئے ہیں ان میں سے کسی دو کی شکلیں بھی کُلّی طور پر ایک دوسرے سے نہیں ملتیں اسی طرح ہر شخص کی انگلیوں

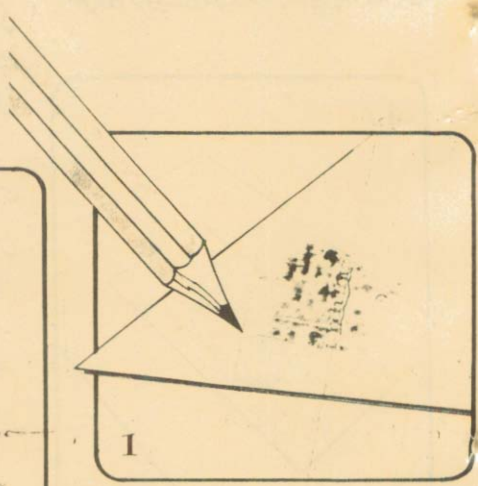


پنسل کو اچھی طرح دبا کر کاغذ پر رگڑیں۔

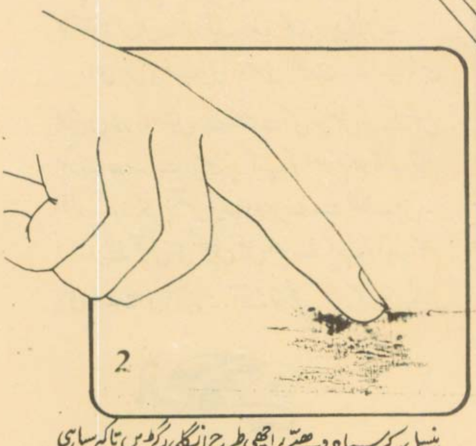


پنسل کے سیاہ دھبے پر اچھی طرح انگلی رگڑیں تاکہ سیاہی لگ جائے۔

کے نشانات بھی مختلف ہوتے ہیں۔

آپ اپنا ہاتھ پھیلا کر آنکھوں کے سامنے لائیں تو دیکھیں گے کہ انگلیوں کی جلد کی اوپر والی تہہ پر باریک باریک لائنیں ابھری ہوئی ہیں۔ ان کی مدد سے ہم کسی شے کو مضبوطی سے پکڑ سکتے ہیں۔ یہ لائنیں اس شے کو ہماری گرفت سے پھسلنے سے روکتی ہیں۔ ہر شخص کی انگلیوں کی ان لائنوں کی بناوٹ مختلف ہوتی ہے۔ فنگر پرنٹس لینے اور ان کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کو جانچنے کا طریقہ بہت آسان ہے۔

سب سے پہلے آپ ایک عدد ایچ بی کی پنسل ایک سفید کاغذ اور ایک اسکواش ٹیپ لیں۔ پنسل کو دبا کر کاغذ پر رگڑیں حتی کہ کاغذ پر ایک سیاہ دھبہ بن جائے اس کے بعد اپنی انگلی کی پور کو اس دھبے پر رگڑیں یہاں تک کہ انگلی اچھی طرح کالی ہو جائے اگر ضرورت محسوس ہو تو مزید پنسل گھس کر سیاہی حاصل کریں اب انگلی کے سیاہ حصے کو اسکواش ٹیپ کے ایک ٹکڑے کی لیس دار سائیڈ پر اچھی طرح دبا کر کچھ دیر رکھیں لیجئے آپ کا فنگر پرنٹ تیار ہے۔ ٹیپ کو موڑ کر اس نشان کو محفوظ کرلیں۔ اور ایک سفید کاغذ پر چپکالیں۔

اسی طرح آپ اپنی دوسری انگلیوں کے اپنے بہن بھائیوں اور دوستوں کے نشانات بھی حاصل کر سکتے ہیں، محدب عدسہ سے دیکھنے پر آپ کو معلوم ہو گا کہ تمام افراد کے فنگر پرنٹس ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

دیکھئے کھیل ہی کھیل میں ہم نے آپ کو ایک کام کی بات بتادی اعتبار نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔

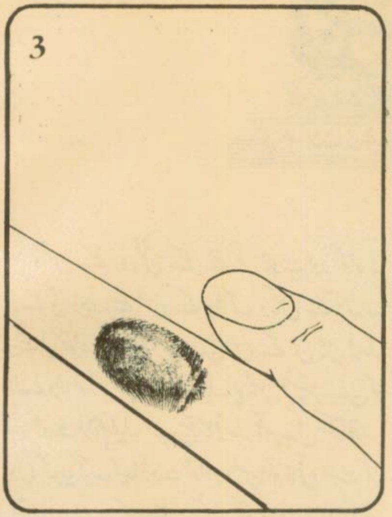


انگلی کو دبا کر ٹیپ کی لیس دار سائیڈ پہ کچھ دیر رکھیں۔

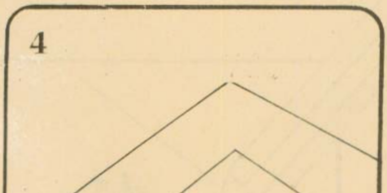


ٹیپ موڑ کر نشان محفوظ کرلیں۔

# دوسرے سیارے کی ایک کہانی

سلام سلامی

وہ سمندر کہاں واقع تھا اور اس سمندر کے درمیان وہ حیران کن چھوٹا سا جزیرہ کس جگہ تھا اور اس چھوٹے سے جزیرے کے اندر کئی سمندروں سے بڑا وہ حیرتناک سمندر کہاں سے آ گیا تھا؟ یہ وہ سوال ہیں جن کا جواب شاید کبھی نہیں مل سکے گا۔

دس پروں والی اڑن موٹر سائیکل پر دس افراد سوار تھے۔ اڑن موٹر سائیکل کی ٹنکی میں ہوا اور اس کے پہیوں میں پٹرول بھرا جاتا تھا۔ رات کا وقت تھا اور آسمان پر سورج چمک رہا تھا جس کی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں اپنی موٹر سائیکل جھاڑیوں اور پودوں کے صاف ستھرے راستے پر دوڑی چلی جا رہی تھی جھاڑیوں اور پودوں کی اس دو طرفہ سڑک کے دونوں کے طرف دور تک پختہ فرش پھیلا ہوا تھا جس پر کوئی

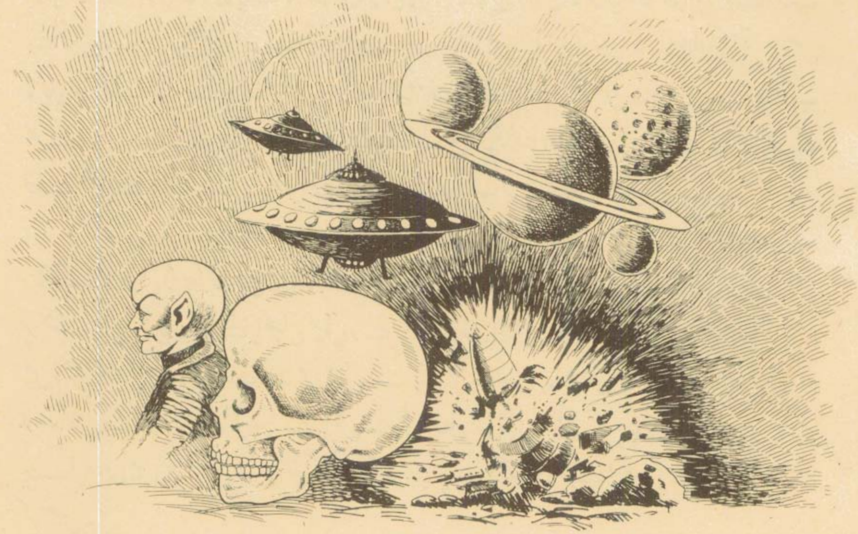

گاڑی چلانا بڑا مشکل تھا اڑن موٹر سائیکل کی چھوٹی سی گدی جس پر دس افراد بیٹھے تھے سب سے آخر میں (روم ی ز) رومیز تھا جو گاڑی چلا رہا تھا یہ لوگ چاہتے تھے کہ رات کے وقت زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لیں کیونکہ دن میں چاند کی تیز روشنی میں سفر کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔

یہ لوگ ایک دن اور ایک رات یا شاید ایک سو دن اور ایک سو رات سفر کرتے رہے اور اگلی شام کو جب دن کا اندھیرا اور رات کا اجالا دونوں ایک دوسرے سے ملنے آئے تو یہ لوگ اسی حیران کن چھوٹے سے جزیرے پر پہنچ گئے جو انہیں کب سے بلا رہا تھا۔

جزیرے کا پہلا ویرانہ نہایت آباد تھا۔ ہر طرف شور شرابے کا سناٹا چھپا ہوا تھا۔ جزیرے کے لوگ دن بھر کی نیند کے بعد اب بیدار ہو گئے تھے اور شام کے ناشتہ کی تیاریوں میں مصروف نظر آرہے تھے۔ اڑن موٹر سائیکل پر سوار ساریکا کی دس افراد کی ٹیم نے ایک اچھے سے قبرستان پر جاکر گاڑی روکی اس قبرستان کی رنگین روشنیاں دور سے نظر آرہی تھیں اور یہ جزیرے کا سب سے مہنگا اور سب سے اچھا قبرستان تھا۔ دور دیسوں سے آنے والے اکثر مہمان اسی قبرستان میں قیام کرتے تھے۔ یہ قبرستان ۲۵ منزلہ تھا اور زمین کے اندر، نیچے، دور تک چلا گیا تھا ہر منزل پر ایک سو شاندار اور پُر آسائش قبریں تھیں جن میں سے ہر ایک میں سیاہ ٹیلی ویژن، گرم پانی اور مشروبات کے لئے ہیٹر تازہ گرم ہوا کے لئے ایئر کنڈیشنر لگے ہوئے تھے۔ رومیز نے کاؤنٹر پر جاکر اپنا تعارف کرایا اور منیجر سے پہلی منزل پر دس قبریں مانگیں ہر قبر کا کرایہ ۵۰ نکالر تھا (نکالر جزیرے کا سکہ تھا) دس قبروں کے چار راتوں کا کرایہ ۵۰ نکالر فی قبر کے حساب سے منیجر نے رومیز کو پیشگی ادا کر دیئے قبرستان کے باوردی ملازمین نے ان لوگوں کا سامان ان کی قبروں میں پہنچایا اور کھانے کے لئے پوچھا چونکہ یہ لوگ خاصا سفر کر کے آرہے تھے اس لئے ان کے پیٹ خوب بھرے .... ہوئے تھے چنانچہ انہوں کھانے کے لئے تلی ہوئی ہوا بھنا ہوا پانی اور پینے کے لئے مگر مچھ کے انڈے منگوائے کھانا بہت لذیز تھا اس لئے انہوں نے سارا کھانا اپنے سروں میں پھینک دیا۔

تھوڑی دیر بے آرام ہو کر یہ لوگ جزیرے کی سیر کو نکلے قبرستان سے تھوڑی دیر ایک رنگا رنگ کارنیوال لگا ہوا تھا جس میں سارے اسٹال خالی تھے اس لئے وہاں بہت ہجوم تھا۔ تماشائی ہر خالی اسٹال پر مختلف چیزیں خرید رہے تھے یا کھیل کھیل رہے تھے ایک خالی اسٹال پر ہاتھیوں کا فٹ بال میچ ہو رہا تھا جس میں ہاتھی شیشہ کی چوکور گیند سے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ایک اور بڑے اسٹال پر جہاں بہت ویرانی تھی اور لوگوں کے ہجوم اور شور کی وجہ سے بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی جنگل کے پرندوں کی تصویریں بڑے بڑے فریموں میں سجا کر اسی طرح لگائی گئی تھیں کہ سب پرندے ایک دوسرے کی چونچ سے چونچ ملا کر باتیں کر سکیں۔

نشانہ بازی کے اسٹال پر راجینا نے ضد کی وہ نشانہ بازی نہیں کرے گی چنانچہ اس نے پانی کے پستول سے نشانے لگائے اور توپ کے گولوں سے نشانہ لگا کہ سوئی کے دونوں ٹکڑوں کو جوڑ دیا۔ تماشائیوں نے اس تماشہ پر اپنا سر پیٹ لیا رو رو کے ان کا برا حال ہو گیا۔

اگلے دن جب ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور تھوڑی دیر بعد جب سورج مغرب سے نمودار ہوا اور اس کا تھال آسمان پر چڑھنے لگا تو ساریکا مہم کے دسوں افراد اس حیران کن جزیرے کے درمیان حیرت ناک سمندر کے کنارے پہنچ گئے جو کئی سمندروں سے بڑا سمندر تھا۔

ٹیم کے لیڈر رومیز نے ٹیم کے سب سے ٹھگنے نمبر دس فٹ دس انچ کے ٹمسن کو بلایا کہ اس سے کشتی مانگی ٹمسن نے اپنی قمیص کی پچھلی جیب سے کاغذ کی چھوٹی سی کشتی نکال کر رومیز کو دی جو اس نے پچھلی رات کو ایک کارخانے میں جاکر بنوائی تھی۔ ان کی مہم کا سب سے آسان مرحلہ اب شروع ہونے والا تھا جس میں جان کا خطرہ بھی تھا۔ سب لوگ اسی آسان مہم کی آسانیوں سے پر جوش تھے دو ایک ممبر کچھ خوف زدہ بھی نظر آرہے تھے خود آنے والے جانے پہچانے لمحوں کی دہشت سے ان کے رنگ سرخ پڑ گئے تھے۔

سورج نے جیسے ہی آسمان پر ایک چوتھائی سفر طے کیا رومیز نے کاغذ کی کشتی سمندر میں ڈال دی۔ اس سمندر کا پانی بالکل خشک تھا، چنانچہ ان کی کاغذ کی کشتی گیلی ہو گئی رومیز نے سب کو اشارہ کیا اور پہلے ٹمسن، موریکا، جارمینو، تحولیر کشتی میں بیٹھے اور ان کے بعد پانچوں لڑکیاں راجینا، سلادیہ، تانیہ، زورینہ اور نیہ ہاش کاغذ کی ناؤ میں سوار ہو گئیں سب سے آخر میں رومیز کشتی کے پیندے پر سوار ہوا۔

یہ کشتی اسی خشک پانی کے سمندر میں اس طرح سفر کر رہی تھی کہ اس کا پیندا اوپر تھا اور دسوں مسافر کشتی کے اندر الٹے بیٹھے ہوئے تھے۔پانی کی لہریں اونچی اور تیز ہوتی جا رہی تھیں اور خشک پانی کے چھینٹوں سے ان کے لباس گیلے ہو رہے تھے۔

جیسے جیسے سورج اونچا ہوتا گیا سمندر کی تیزی بھی بڑھتی گئی اور اس کی لہریں تند اور اونچی ہوتی گئیں آدھی رات کے وقت جب سورج بالکل درمیان میں تھا انہیں اپنی مہم شروع کرنی تھی اور اب آدھی رات میں بہت دیر ہی رہ گئی تھی۔

سمندر کی موجیں بلند سے بلند تر ہو رہی تھیں اور کاغذ کی یہ چھوٹی سی کشتی جس میں مہم کے دس مسافر سوار تھے ان لہروں کے ساتھ اونچی اٹھتی اور پھر تیزی سے نیچے آتی۔ سب کے دل خوف سے بلیوں اچھل رہے تھے۔رومیز نے اپنی پاس بین نکال کر دیکھا سورج بالکل ان کے اوپر تھا اور اس کی سطح پر ایک ۱۰ سال کا بہت ضعیف بوڑھا آدمی لیٹا ہوا تھا جس کے لمبے لمبے بال نیچے سمندر کی طرف لٹک رہے تھے

یہ بال رسیوں جیسے تھے اور اتنے چھوٹے تھے کہ سورج کی بلندی سے نیچے سمندر کی سطح سے کچھ بلندی تک پہنچ گئے تھے ساریکا مہم کی کشتی اور ان رسیوں جیسے لٹکتے بالوں کے درمیان ایک سو فٹ کا فاصلہ تھا جب سمندر کی کوئی اونچی لہر آتی تو کشتی اوپر اٹھ جاتی اور یہ فاصلہ کم ہو جاتا۔

سورج پر لیٹا ہوا دس سال کا بوڑھا ہاتھ ہلا ہلا کر انہیں اشارے کر رہا تھا کہ آؤ ............ میرے پاس آؤ ............ میں سورج کا بیٹا ہوں تمہیں سورج کی سیر کراؤں گا۔"

رومیز نے تانیہ سے کہا کہ اب جب کشتی کسی اونچی لہر سے بلند ہو تو وہ اچھل کر بوڑھے کے رسیوں جیسے بالوں کو پکڑنے کی کوشش کرے تیسری مرتبہ تانیہ بوڑھے کے بال پکڑنے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے رسیوں جیسے بالوں کے سہارے سورج کی سمت چڑھنا شروع کر دیا جب وہ خاصی بلندی پر پہنچ گئی زورینہ، سلادیہ راجینا اور نیہاش بھی ایک ایک کر کے بوڑھے کے بالوں سے لٹک کر اوپر چڑھنے لگیں۔ لڑکیوں کے بعد لڑکوں کی باری تھی موریکا، جارمینو، تحولیر اور رومیز اوپر چڑھتے اور سب سے آخر میں ٹمسن کی باری آئی لیکن ٹمسن کو اپنے دس فٹ دس انچ کے ٹھگنے قد کی وجہ سے کشتی سے اچھل کر بوڑھے کے بالوں کی لٹ کو پکڑنے میں بڑی آسانی ہوئی اس نے کئی مرتبہ کوشش کی، تین دفعہ وہ کشتی میں گر پڑا، ایک بار سمندر کے خشک پانی میں جا گرا جہاں ایک مگرمچھ نے اسے اپنے منہ میں پکڑ لیا اور بہت سا پانی منہ میں بھر کر زور سے کلی کی تو پانی کے زبردست ریلے کے ساتھ جو مگرمچھ کے منہ سے نکلا تھا ٹمسن ایک دم سورج کی سطح پر پہنچ گیا۔ جیسے ہی ٹمسن نے سورج کی ٹھنڈی، خشک زمین پر قدم رکھا دس سال کا بوڑھا ایک دم غائب ہو گیا البتہ اس کے رسیوں جیسے چھوٹے بال وہیں پڑے رہ گئے ساریکا مہم کے لوگوں نے اب سورج پر اپنا سفر شروع کیا انہوں نے بوڑھے کے رسیوں جیسے بالوں سے ایک ہوائی جہاز بنایا جو سورج کی سطح پر تیر سکتا تھا اور سب لوگ اس جہاز میں سوار ہو کر اس خزانے کی تلاش میں نکل پڑے جو سورج کے سمندر کی تہہ میں کہیں بکھرا پڑا تھا۔

ایک گھنٹہ کا یا شاید ایک ہزار سال کا سفر طے کر کے یہ سورج کے سمندر کے کنارے پہنچ گئے اور پھر رومیز نے اپنے تیرنے والے جہاز کو چھوڑ کر پانی میں اڑنے والا راکٹ برآمد کیا جو اس کے تھیلے کی چھوٹی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ اب سب لوگ راکٹ پر سوار ہوئے اور رومیز نے اسے سورج کے سمندر کے ٹھنڈے پانی میں اتار دیا۔ راکٹ پانی میں اڑتا رہا بالآخــــر انہیں سورج کے سمندر کے اندر آباد گاؤں کی روشنیاں نظر آنے لگیں یہ لوگ جب گاؤں میں پہنچے تو گاؤں کے لوگ ہاتھوں میں پھولوں کی لاٹھیاں اور ڈنڈے لے کر ان کو الوداع کہنے آئے۔ گاؤں کے بینڈ باجے نے ماتمی اور غمگین دھنیں بجا کر خوشی کا اظہار کیا اور بچوں نے مہم کے ارکان کے راستے میں پتھر اور کنکریاں بچھا کر ان کا استقبال کیا۔

یہ گاؤں بہت آباد گاؤں تھا یہاں آبادی بہت تھی اور پورے گاؤں میں دس آدمی رہتے تھے سورج کے سمندر کے اندر اس گاؤں میں مکان الٹے بنے ہوئے تھے ان کی چھتیں زمین پر تھی اور فرش اوپر تھے گاؤں کی اوندھی گلیوں سے گزر کر یہ دوسری طرف پہنچے تو انہیں کالے پتھروں کا قیمتی خزانہ ہر طرف بکھرا ہوا نظر آیا۔ مہم کے لوگوں نے اپنے تھیلوں کو ان پتھروں سے جلدی جلدی خالی کیا اور یہ کالے پتھروں کا یہ قیمتی خزانہ لے کر ........... وہ واپسی کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

کائنات کتنی وسیع اور عریض ہے اس کا اندازہ انسان ابھی تک نہیں کر سکا ہے ہمارا پورا نظام شمسی جس میں سورج اور اس کے گرد گردش کرنے والے نو سیارے اور ان سیاروں کے گرد گھومنے والے چاند سب شامل ہیں اسی کائنات کا ایک بہت چھوٹا بہت ہی چھوٹا حصہ ہے ........... اس کائنات میں نہ جانے کتنے نظام شمسی بکھرے ہوئے ہیں اور ان میں نہ جانے کتنے سیارے اور ستارے موجود ہیں ممکن ہے ہماری زمین سے لاکھوں، کروڑوں، اربوں میل کے فاصلے پر کوئی سیارا ہو جہاں ہمارے جیسے انسان ہوں اور ان کے یہاں کی کچھ چیزیں ہمارے یہاں کی چیزیوں سے مختلف ہوں شاید وہاں سورج رات کو نکلتا ہو اور چاند دن میں طلوع ہوتا ہو ممکن ہے وہاں اڑن موٹر سائیکل ایجاد کر لی گئی ہو اور پانی میں اڑنے والا راکٹ بنا لیا گیا ہو ....... یہ حیرت ناک کہانی اسی سیارے کی ہے۔

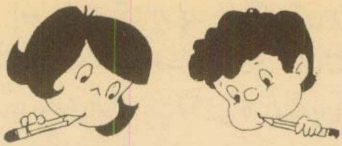

# کیا آپ کو رسائل سے شکوہ ہے کہ وہ آپ کی نگارشات شائع نہیں کرتے ؟

اگر ایسا ہے ... تو پھر غور کیجئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ یقیناً —— آپ سے کہیں کوئی غلطی ضرور سرزد ہوجاتی ہوگی۔

## اگر آپ مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھیں تو

آپ کی تحریریں شائع نہ ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں۔

- —— اپنی نگارشات، صاف، خوشخط، کاغذ کے ایک جانب سطر چھوڑ کر لکھیں تاکہ پڑھنے میں بھی دقت نہ ہو اور اگر مدیر چاہے تو اس کی نوک پلک سنوار سکے۔
- —— کہانی یا مضمون لکھنے سے پہلے اس کے مرکزی خیال پر کسی اچھا لکھنے والے سے گفتگو ضرور کریں ممکن ہے وہ آپ کو بہتر مشورہ دے دے اسی طرح اپنی تحریر مکمل کرنے کے بعد اپنے استاد، بزرگ یا کسی پڑھے لکھے فرد کو دکھائیں تو بہتر ہوگا۔
- —— جو تحریریں رسائل میں شائع ہوتی ہیں انہیں بغور پڑھئے اور اُس کے دلچسپ پہلوؤں کو تلاش کیجئے جن کی وجہ سے انہیں قابلِ اشاعت سمجھا گیا۔
- —— اکثر ساتھی جس صفحے پر خط لکھتے ہیں اُسی پر نظم یا لطیفہ یا کہانی بھی لکھ دیتے ہیں جو غلط ہے۔ آپ ہر تحریر کے لئے علیحدہ علیحدہ کاغذ استعمال کریں۔
- —— تحریر مختصر اور جامع لکھنے کی کوشش کریں۔ اکثر تحریریں محض غیر ضروری طوالت کی وجہ سے ردّ کردی جاتی ہیں۔
- —— لکھنے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچیں اور کہانی کا مرکزی خیال، یا مضمون کے موضوعات ایسے تلاش کریں جن میں نیاپن ہو یا جس پر زیادہ تر نہ لکھا گیا ہو اسی طرح خشک موضوعات یا ایسے عنوانات پر نہ لکھیں جس پر بچوّں کی اکثریت پڑھنا پسند نہ کرتی ہو۔
- —— اچھا لکھنے کے لئے مطالعہ بہت ضروری ہے لہٰذا اچھی کتب اور اچھے رسائل کو پڑھنا اپنی عادت بنا لیجئے۔ اگر ایسا نے ایسا کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ مستقبل کے بہت بڑے ادیب یا شاعر نہ ہوں۔

سیّد نظر زیدی

# معصوم قیدی

(قسط نمبر ۷)

تینوں دوست محمد بن قاسم، موذ اور سعید آپس میں باتیں کرتے ہوئے بصرہ شہر سے باہر پہنچے۔ یہاں وہ اپنے ایک اور دوست کا انتظار کرنے لگے جو ان کے واسطے سواری کے گھوڑے لینے گیا ہوا تھا۔ موذ اور سعید آئندہ عید کو ہونے والے سالانہ فوجی کرتبوں اور ان میں حصہ لینے کے اپنے ارادوں کے بارے میں ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ اس

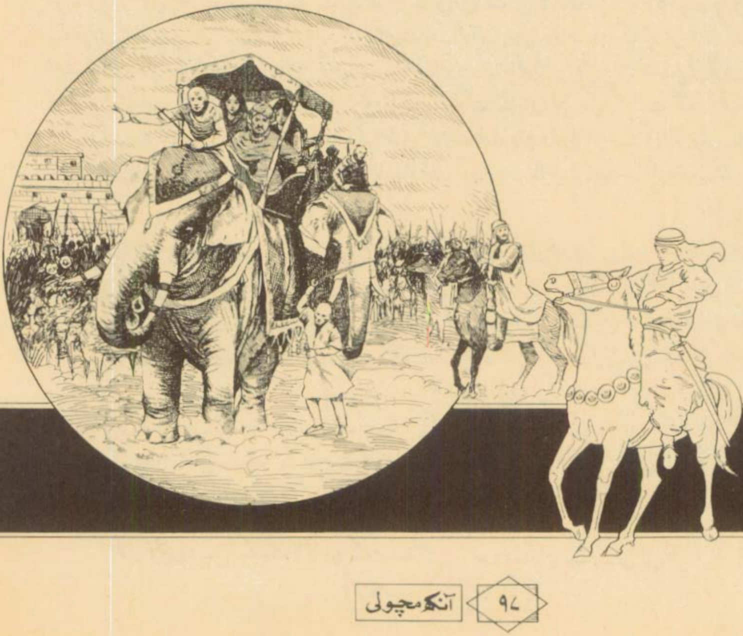

دوران ان کے گھوڑے پہنچ گئے اور وہ لوگ ان پر سوار ہو کر شہر سے ذرا دور دریا کنارے چلے گئے جہاں انہیں تیرنے، نیزہ بازی اور تلوار بازی کی مشق کرنی تھی۔ مشق کے بعد جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو ایک ڈاکو ان سے گھوڑے اور تلواریں چھیننے کی نیت سے وہاں آیا محمد بن قاسم سے مقابلے کے بعد شکست کھا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ڈاکو دراصل اسلامی فوج کے ایک بہادر جرنیل بدیل تھے جو ان نوجوانوں کا امتحان لینے آئے تھے۔

عید کے دن دمشق کے باہر ایک کھلے میدان میں فوجی کھیلوں کے مقابلے کا انتظام کیا گیا تھا اور دن بھر مختلف کھیلوں کے مقابلے ہوتے رہے تھے۔ شام کو بالآخر ایک نوجوان تلوار بازی اور نیزہ بازی کے مقابلوں میں سب کو شکست دے کر میدان میں اکیلا رہ گیا۔ وہ چیلنج دینے کے انداز میں اپنا گھوڑا ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔ اس کے لباس سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کس ملک کا باشندہ ہے۔ چہرے کو نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ آخر میں امیر المومنین کے چھوٹے بھائی سلیمان بن عبدالملک اس نوجوان کے مقابلے میں آئے مگر شکست کھا گئے۔ اب وہ نوجوان ایک انوکھی شان سے میدان میں تنہا کھڑا تھا۔ کوئی اس کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ سارا میدان اس کے لئے نعرہ ہائے تحسین سے گونج رہا تھا۔ امیر المومنین نے جب انعام دینے کے لئے اس کو اپنے قریب بلایا تو پتہ چلا کہ وہ محمد بن قاسم ہے۔ سب لوگ خوش ہوئے اور خاص طور پر امیر المومنین۔ محمد بن قاسم کی ذہانت علمی اور فوجی قابلیت کے پیش نظر امیر المومنین نے اس فارس کا والی مقرر کر دیا اور محمد بن قاسم اپنی والدہ سے مشورہ کرنے کی اجازت لے کر گھر چلا گیا۔

ان دنوں سندھ پر راجہ داہر کی حکومت تھی۔ یہ راجہ بہت ظالم اور بے ایمان شخص تھا۔ اس کی ایک برائی یہ تھی کہ اس نے اپنی سگی بہن سے شادی کر رکھی تھی۔ راجہ کے سارے درباری اس کے خوشامدی تھے، ایک دن بھرے دربار میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ لنکا سے آنے والے مسلمانوں کے دو تجارتی جہازوں کو لوٹ لیا جائے۔ ان جہازوں میں صرف عورتیں اور بچے تھے۔ ان کو لوٹنے کا کام سمندری ڈاکوؤں کے ذمے لگایا گیا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے بلکہ ایک نوجوان مسلمان کی قیادت میں لڑتے ہوئے عورتوں اور بچوں نے ان ڈاکوؤں کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔

ابھی وہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ایک بار پھر کئی بڑے بڑے جہاز ان کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ یہ راجہ داہر کی فوج تھی۔ زید ہر قسم کی صورت سے نمٹنے کے لئے تیار تھا مگر سندھی فوج نے صلح کا جھنڈا لہرا کر دھوکا دیا اور چالاکی سے مسلمانوں کے دونوں جہازوں پر قبضہ کر کے عورتوں اور بچوں سمیت سب کو قیدی بنالیا۔ راجہ داہر کے قید میں ان لوگوں پر بہت مظالم ڈھائے گئے۔ زید کو ان لوگوں نے دیوی پر قربان کرنے کا انتظام کر رکھا تھا مگر عین موقع پر چند نقاب پوش قربان گاہ پہنچے اور زید کو آزاد کرا لیا گیا۔ یہ ہندوستان کے مظلوم، نیچی ذات کے لوگ تھے جو راجہ کے ظلم سے تنگ آکر اب آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ زید نے انہیں یقین دلایا کہ اسلامی حکومت ضرور راجہ داہر کو سزا دے گی اور یہاں کے غریب اور ستم رسیدہ لوگوں کو اس کے ظلم سے نجات دلائے گی۔ نقاب پوشوں کے سردار نے زید کو بحفاظت ملک عرب تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔

عراق کا حکام حجاج بن یوسف اپنے دربار میں ایک سفیر کی زبانی ترکستان اور اندلس میں مسلمانوں کی جنگی کامیابیوں کی خبریں سننے کے بعد یہ فرمان جاری کرتا ہے کہ دونوں سپہ سالاروں کو سختی سے بتا دیا جائے کہ ان کا کوئی سپاہی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ غیر مذہب والوں کی کوئی عبادت گاہ تباہ نہ ہو۔ ان کے باغ اور کھیت برباد نہ کئے جائیں۔ اسی دوران سندھ سے فرار ہونے والا نوجوان زید دربار میں پہنچتا ہے اور اپنی داستان سناتا ہے حجاج بن یوسف غصے سے کانپ اٹھتا ہے اور سندھ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ابتداً دو مسلمان جرنیلوں کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف اور امیر المومنین ولید بن عبدالملک اور دیگر سردار یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ سندھ کی طرف بھیجی جانے والی فوج کا سالار محمد بن قاسم کو بنایا جائے حالانکہ امیر المومنین کے چھوٹے بھائی سلیمان بن عبدالملک اس تجویز کی مخالفت کرتے ہیں مگر پھر بھی محمد بن قاسم کی قیادت میں فوج سندھ کی طرف بھیج دی جاتی ہے۔

اسلامی فوجیں دیبل کے قلعے کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔ سندھ کے راجہ نے میدان میں نکل کر لڑنے کی بجائے قلعہ

بند ہو جانے کو ترجیح دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسلامی فوج کسی طرح بھی قلعے کی مضبوط دیواروں کو توڑ نہیں سکتی۔ اس لئے خود ہی تھک کر چلی جائے گی۔ محمد بن قاسم نے کئی دن تک انتظار کیا اس کے بعد وہ کسی نئی منصوبہ بندی کے لئے قلعے کا چاروں طرف سے جائزہ لینے کو نکلا تو ایک جگہ اس کی ملاقات ایک بوڑھے ہندو سے ہوگئی جس نے بتایا کہ اگر قلعے کے اوپر لگا ہوا جھنڈا گرا دیا جائے تو مسلمانوں کو فتح ہو سکتی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ فتح کے بعد محمد بن قاسم نے ایک جلسہ عام میں اسلامی مساوات اور عدل کے عملی مظاہرے کے ساتھ پرجوش خطاب بھی کیا۔ ہندو عوام اپنے نئے آقاؤں سے بہت خوش تھے۔

## اب آپ آگے پڑھیے

آپ کو یاد ہوگا سندھ کے راجہ کی فوج نے دیبل کی بندر گاہ کے پاس پہنچ کر مسلمان عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا تھا اور ان کے جہازوں کا سامان لوٹ کر اپنے ساتھ لے آئے تھے، آپ سوچ رہے ہونگے ان ظالموں نے ان عورتوں اور بچّوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اب وہ کس حال میں ہیں! آیئے ہم آپ کو بتائیں۔

راجہ کے ظالم سپاہیوں نے ان عورتوں، بچوں اور ملاحوں کو گرفتار کر کے سب سے پہلے مان سنگھ کے سامنے پیش کیا۔ راجہ کے دربار میں اس کی باتیں سن کر آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ فوجی سردار مسلمانوں کا بہت بڑا دشمن اور ظالم تھا۔ اس نے پہلے تو طرح طرح کے لالچ دے کر یہ کوشش کی کہ یہ قیدی اپنا مذہب بدل کر ہندو بن جائیں، لیکن اس کوشش میں اسے ذرا بھی کامیابی نہ ہوئی۔ ننھے ننھے بچوں تک نے صاف کہہ دیا کہ چاہے ہمیں جان سے مار دو لیکن اسلام سے منہ نہ موڑیں گے۔

اس کے بعد ظالم مان سنگھ نے ان مظلوم قیدیوں کو سخت تکلیفیں دینی شروع کیں۔ انہیں کئی کئی دن بھوکا رکھ کر کوڑوں سے پٹواتا اور بھاری بھاری زنجیریں پہنا کر اندھیری کوٹھڑیوں میں بند کرا دیتا۔ لنکا کے غریب ملاحوں، ناخدا اور جہازوں کی حفاظت کرنے والے سپاہیوں کو تو اس نے قتل ہی کرا دیا۔ وہ ان عورتوں اور بچوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا چاہتا تھا لیکن مجبوری یہ آ پڑی کہ خود راجہ نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

اس بات سے آپ یہ مت سمجھ لیجئے کہ راجہ داہر نے ان قیدیوں پر ترس کھا کر انہیں موت سے بچا لیا تھا، بلکہ اس نے یہ کہہ کر انہیں قتل ہونے سے بچایا تھا کہ جب ان کی حمایت کے لئے آنے والی فوج ہار جائے گی اور اس کے افسر اور سپہ سالار گرفتار ہو کر آئینگے تو ان عورتوں اور بچوں کو ان کے سامنے قتل کیا جائے گا تا کہ انہیں زیادہ رنج ہو۔

جس وقت مجاہدوں کی فوج نے دیبل پر حملہ کیا یہ معصوم قیدی اس شہر کے ایک قید خانے میں

تھے۔ جب تک شہر کے حاکم کو یہ امید رہی کہ ہم مسلمانوں کے مقابلے میں ہار نہیں سکتے۔ اس نے ان قیدیوں کو اس جگہ رکھا لیکن جیسے ہی مسلمانوں کے جیتنے کا یقین ہوا، بند گاڑیوں میں بٹھا کر انہیں اس شہر کی طرف روانہ کر دیا جہاں راجہ داہر رہتا تھا۔

اس وقت یہ مظلوم عورتیں اور بچے بھاری بھاری زنجیروں میں جکڑے ہوئے راجہ داہر کے دربار میں کھڑے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک بہت کمزور ہو گیا ہے، لیکن کسی کے چہرے سے بھی ڈر یا گھبراہٹ ظاہر نہیں ہو رہی۔ عورتیں سر جھکائے برابر زمین کی طرف دیکھ رہی ہیں البتہ بچوں میں سے کبھی کبھی کوئی راجہ یا درباریوں کی طرف دیکھ لیتا ہے۔

راجہ داہر اس وقت بہت غصے میں ہے، وہ کبھی جھنجلا کر اپنی تلوار کے دستے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ کبھی قیدی عورتوں اور بچوں کو گھورنے لگتا ہے اور کبھی منہ ہی منہ میں بڑ بڑانے لگتا ہے۔ اس نے ایک بچے کی طرف دیکھ کر غصے بھری آواز میں کہا، "اچھا تو تو اس بات سے بالکل نہیں ڈرتا کہ تیرے جسم کے ٹکڑے کر کے چیلوں اور کوّوں کے سامنے پھینک دیئے جائیں؟"

بچہ:۔ "ہاں میں اس بات سے بالکل نہیں ڈرتا، کیونکہ مجھے معلوم ہے ہر جاندار کو ایک دن موت ضرور آنی ہے۔ پھر اس سے اچھی موت کیا ہوگی کہ میں سچائی کے راستے پر چلتا ہوا شہید ہو جاؤں!"

راجہ:۔ "اچھا تو میں تیرا یہ ارمان ابھی پورا کئے دیتا ہوں (ایک سپاہی کی طرف دیکھ کر) سپاہی! آگے بڑھ کر اس بدتمیز بچے کے اسی جگہ ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔"

بچہ:۔ (اطمینان بھری آواز میں) "واہ یہ بھی کوئی بہادری کی بات ہے، مزہ تو جب ہے کہ میرے ہاتھ کھول دو اور مجھے بھی ایک تلوار دے دو۔ پھر دیکھنا پہلے کون ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔"

راجہ:۔ (چلّا کر) "خاموش رہو بدتمیز (سپاہی کی طرف دیکھ کر) تو خاموش کیوں کھڑا ہے۔ ہمارا حکم پورا کیوں نہیں ہوا ابھی تک!"

راجہ کا یہ حکم سن کر ڈراؤنی صورت والا ایک سپاہی بچے کی طرف جھپٹا۔ لیکن قیدی عورتوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر بچے کو جلدی سے اپنی گود میں چھپا لیا۔ اور راجہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "اے راجہ! یہ بات کچھ اچھی نہیں کہ تو بچے کے ساتھ بچہ بن کر یوں بحث کرے۔ ہم ایک نہیں ہزار بار کہہ چکے ہیں کہ ہمیں اپنا ایمان اپنی جان سے زیادہ پیارا ہے، اگر تجھے ہم بے گناہوں کے ساتھ ایسی ہی دشمنی ہے تو ایک ہی بار سب کے قتل کر دینے کا حکم کیوں نہیں دیتا؟ لیکن یہ بات کان کھول کر سن لے۔ تجھے ہمارے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا پڑے گا۔ اسلامی فوج تیرے ملک کے کتنے ہی شہر فتح کر چکی ہے۔ بس اب کوئی دن جا رہا ہے کہ یہ شہر بھی اس کے قبضے میں ہوگا اور اسلامی فوج کے سپہ سالار کے

سامنے خود تجھے اس طرح پیش کیا جائے گا جس طرح ہم تیرے سامنے قیدی بنے کھڑے ہیں۔"
راجہ:۔ معلوم ہوتا ہے اس امید نے تمہیں ایسا مغرور بنا دیا ہے لیکن اے بیوقوف عورت اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ تیری یہ امید کبھی پوری نہ ہوگی۔ بدوؤں کی اس فوج کے سرداروں کو تو بہت جلد زنجیروں میں بندھا اپنے پاس کھڑا دیکھے گی۔"
عورت:۔ "تو پھر تو ہمیں قتل کرنے کا حکم کیوں نہیں دیتا؟"
راجہ:۔ "صرف اس لئے کہ تمہارے اسلام سے پھر جانے کی خوشی تمہارے قتل کرنے کی خوشی سے زیادہ ہوگی۔"
عورت:۔ "تو اطمینان رکھ یہ خوشی تجھے کبھی حاصل نہ ہو سکے گی۔"
راجہ:۔ "دیکھا جائے گا، تو نے سنا نہیں۔ مار کے آگے بھوت ناچتے ہیں۔ اب تک میں نے تم لوگوں کی خاص رعایت کی ہے۔ لیکن اب میں حکم دوں گا کہ تم میں سے ہر ایک کو خوب تکلیفیں دی جائیں۔ تمہارے جسم کی بوٹیاں کاٹی جائیں، تمہیں شکنجوں میں رکھا جائے۔"
یہاں تک کہہ کر راجہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کی فوج کا ایک بڑا سردار بھاگتا ہوا دربار میں داخل ہوا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا:۔
افسر:۔ "مہاراج! مہاراج! دیبل کے مسلمانوں نے یزدان اور سوستان کے علاوہ ہمارے کئی اور شہر بھی فتح کر لئے ہیں اور مجھے ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ اب ان کا رخ ہماری راجدھانی کی طرف ہے۔"
راجہ:۔ (پاگلوں کی طرح چلا کر) "تو پھر تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے یہ خبر سن کر میں تمہیں انعام دوں گا! (ایک درباری کی طرف دیکھ کر) وجے ناتھ! اس بزدل کا منہ کالا کر کے شہر میں پھراؤ اور شام ہونے پر قلعے کی دیوار سے نیچے پھینک دو۔"
افسر:۔ "لیکن مہاراج میرا قصور! میری کوئی خطا؟"
راجہ:۔ بکواس بند کرو (وجے ناتھ کی طرف دیکھ کر) وجے ناتھ! لے جاؤ اسے اور فوراً ہمارے حکم پر عمل کرو...... اور ان ضدی عورتوں اور بچوں کو بھی لے جاؤ۔"
وجے ناتھ:۔ "کیا مہاراج انہیں بھی......؟"
راجہ:۔ (سوچتے ہوئے) "نہیں۔ انہیں ابھی قید خانے میں پہنچا دو۔ جب مسلمان سپاہی گرفتار ہو کر آئیں گے تو ہم ان کے سامنے ان کا جلوس نکالیں گے۔"
یہ کہہ کر راجہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چلتے چلتے وزیر کی طرف دیکھ کر کہا، "پورے زور سے لڑائی کی تیاری کرو۔ اگر کوئی مسلمان دریا پار کر کے اسی طرف آگیا تو تم سب کو کولھو میں پلوا

دوں گا۔"

○......○......○......○......○......○

مشہور دریا سندھ کے کنارے دور تک خیموں کی قطاریں نظر آ رہی ہیں، یہ خیمے ایسی خوب صورتی اور ترتیب سے گاڑے گئے ہیں کہ بالکل شہر کا سا منظر معلوم ہوتا ہے، بیچوں بیچ ایک بہت بڑی مسجد بنائی گئی ہے، اور اس مسجد کے چاروں طرف چار کھلی کھلی سڑکیں نکالیں گئی ہیں۔ جن کے دونوں طرف ہر قسم کے سامان کی دوکانیں سجی ہوئی ہیں۔ یہ اسلامی فوج کی چھاؤنی ہے۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے لیکن سپہ سالار محمد بن قاسم اور فوج کے دوسرے بڑے بڑے عہدے دار ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ ان سب کے چہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کسی بہت ہی خاص معاملے پر غور کیا جا رہا ہے۔ سپہ سالار اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے آہستہ آہستہ ٹہل رہے ہیں۔ ان کے باقی ساتھی بیٹھے ہیں۔

سپہ سالار ٹہلتے ٹہلتے ذرا رکے اور اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھ کر بولے، "کچھ بھی ہو ان لوگوں کو تلاش کرنا ہی ہوگا۔ اگر خدانخواستہ اس کام میں ہمیں ناکامی ہوئی تو اس جیسے کئی اور ملک بھی فتح کر کے مجھے خوشی نہ ہوگی۔"

موز:۔ ہمارے ہوشیار ساتھی اور بہت سے سندھی برابر ان لوگوں کا کھوج لگا رہے ہیں، لیکن کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ راجہ نے انہیں کس تہہ خانے میں چھپایا ہے۔ مجھے تو پورا پورا یقین تھا کہ یہ مظلوم بچے اور عورتیں دیبل ہی میں ہونگے لیکن آپ کو معلوم ہے۔ ہم نے وہاں کی ایک ایک چپہ زمین دیکھ ڈالی ہے۔"

محمد بن قاسم:۔ "اس سلسلے میں اور کوئی بات معلوم نہیں ہوئی؟"

ایک فوجی سردار:۔ "ایک سندھی کی زبانی ایک بات سنی تو ہے لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ راجہ داہر نے ایسی غلطی کی ہوگی۔"

محمد بن قاسم:۔ "کیا......؟"

فوجی سردار:۔ (رک رک کر) "اس سندھی کا کہنا ہے راجہ نے ان سب لوگوں کا قتل کر دیا ہے جو لنکا سے آنے والے جہازوں پر سفر کر رہے تھے۔"

محمد بن قاسم:۔ (اونچی آواز میں) "کیا کہا تم نے؟ میں سمجھتا ہوں یہ بات ہرگز سچ نہیں ہو سکتی اگر سندھ کا راجہ داہر بالکل ہی دیوانہ نہیں ہو گیا تو اس نے ایسی بُری حرکت کبھی نہیں کی ہوگی، کیا اسے معلوم نہیں یہ عورتیں اور بچے کس قوم کے تھے۔ کیا وہ مسلمانوں کی غیرت سے ناواقف ہے، کیا اسے ہماری

تلواروں کی تیزی کا اندازہ نہیں ؟"
ایک فوجی سردار:۔ (تلوار نکال کر) "میں قسم کھاتا ہوں۔ اگر اس کم سمجھ راجہ نے واقعی ان بے گناہ قیدیوں کو قتل کرا دیا ہے تو ان کے بدلے میں اس ملک کی اتنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دوں گا کہ شہروں کی نالیوں میں پانی کی جگہ خون بہنے لگے گا۔"
محمد بن قاسم:۔ (گھوم کر غصّے بھری آواز میں) یہ کون ہے۔ یہ فضول بات کس کے منہ سے نکلی؟"
فوجی سردار:۔ "یہ بات میں نے کہی سالار!"
محمد بن قاسم:۔ (نفرت اور غصّے بھری آواز میں) "تم اسی وقت اپنے ہتھیار اتار دو۔ میں آئندہ فوج کے بجائے تمہیں درس گاہ میں دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ تم اسلام کی اچھی باتیں سیکھ کر ایک سچے مسلمان بن سکو۔ کیا تمہیں ابھی تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ہم اس ملک کے بے گناہ بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے نہیں بلکہ ان کی حفاظت کے لئے آئے ہیں۔ اور یہ کہ ہمارا دین صرف ان لوگوں کو سزا دینے کا حکم دیتا ہے جنھوں نے گناہ کیا ہو۔"
فوجی افسر:۔ "اوہ واقعی! غصے اور جوش کی حالت میں میرے منہ سے ایک غلط بات نکل گئی۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا، اصل میں میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ کہ اگر راجہ نے واقعی یہ حرکت کی ہے تو میں اس سے پورا پورا بدلہ لوں گا۔"
محمد بن قاسم:۔ "ہاں یہ بات ٹھیک ہے، راجہ سے اس کے اس بُرے کام کا بدلہ ضرور لیا جائے گا اور میں حکم دیتا ہوں کہ تم سب اسی وقت سے حملے کی تیاری کرو۔ کل کا سورج ڈوبنے سے پہلے میں اپنی فوج کے ایک ایک سپاہی کو دریا کے اس پار دیکھنا چاہتا ہوں۔"
سعید:۔ "لیکن سالار......!"
محمد بن قاسم:۔ "تم کہنا چاہتے ہو یہ کام بے حد مشکل ہے۔"
سعید:۔ "نہ صرف مشکل بلکہ میں اسے ناممکن تک کہنے کے لئے تیار ہوں، آپ نے اندازہ نہیں کیا۔ آج کل دریائے سندھ کتنے زور میں ہے اور دوسرے کنارے پر راجہ نے کتنی فوج اکٹھی کر رکھی ہے! میرا تو یہ خیال ہے کہ ایسی صورت میں ہمارا ایک سپاہی بھی پار نہیں پہنچ سکتا۔"
محمد بن قاسم:۔ "کچھ بھی ہو۔ اب اور انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے ابھی تک ہماری مظلوم بہنیں اور بچے زندہ ہیں، لیکن اگر ہم کچھ دن اور ان کی امداد کو نہ پہنچے تو ظالم راجہ انہیں ضرور نقصان پہنچائے گا۔"

موز:- "لیکن میرے بھائی ......؟"

محمد بن قاسم:- "اللہ کی رحمت پر بھروسہ کرو موز! ہم ایک اچھے کام کے لئے قدم بڑھا رہے ہیں- وہ ضرور ہماری امداد فرمائے گا-"

موز:- "یہ بات بالکل ٹھیک ہے، لیکن اللہ ہی کا یہ حکم بھی تو ہے کہ ہم ظاہری سامان کی طرف بھی دیکھیں- میرے خیال میں تو سندھ جیسے خوفناک دریا کو کشتیوں کے بغیر پار کرنا ناممکن ہے اور اگر یہ بات نہ بھی ہو تو دوسرے کنارے پر دشمن کی ایک بہت بڑی فوج اپنی کمانوں کے چلے چڑھائے تاک میں بیٹھی ہے- اس کے علاوہ ایک مشکل مجھے یہ نظر آ رہی ہے کہ کل سے رمضان شریف کا مبارک مہینہ شروع ہو رہا ہے اور اس گرم ملک میں روزہ رکھ کر لڑنا بے حد مشکل ہو گا-"

محمد بن قاسم:- "جہاں تک ظاہری سامان کا تعلق ہے تم بالکل بے فکر رہو- میں نے ایک ایسی ترکیب سوچ لی ہے کہ کل سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہمارے تمام ساتھی اپنے گھوڑوں اور لڑائی کے سامان سمیت دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں گے اور راجہ کی فوج ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی- البتہ روزہ رکھ کر دشمن کی فوج سے لڑنا ایک ایسی بات ہے جس کا تعلق انسان کی اپنی ہمت سے ہے تو خدا کے فضل و کرم سے میں اپنے ساتھیوں میں ہمت کی کمی نہیں پاتا، ہمارے پاس لڑائی کا سامان کم ہے- گنتی میں بھی ہم بہت کم ہیں، لیکن جہاں تک ہمت اور بہادری کا معاملہ ہے ہمارا ایک ایک مجاہد پہاڑ کی طرح مضبوط ہے- پھر تمہیں یہ بات بھی یاد کرنی چاہئے میرے دوست! روزہ اسی لئے نہیں رکھا جاتا کہ ہم گرمی اور بھوک پیاس سے ڈر کر اپنے گھروں میں بیٹھ رہیں خدا کا شکر ہے مسلمان ابھی ایسے آرام پسند نہیں ہوئے- تم بے فکر ہو کر تیاری شروع کرو- روزہ رکھ مسلمان کا دل اور مضبوط ہو جاتا ہے-"

اسلامی فوج کے سپہ سالار محمد بن قاسم کی یہ باتیں سن کر سب کے سب حیران تھے، لیکن حیرانی کے باوجود ان سب کو پکا یقین تھا کہ کل شام سورج ڈوبنے کے بعد ہم دریا کے دوسرے کنارے پر ہونگے- ہمارے سپہ سالار نے جو کچھ کہا ہے جھوٹ نہیں ہو سکتا، چنانچہ وہ سب اسی وقت سے لڑائی کی تیاری میں لگ گئے-

(باقی آئندہ)


اِسے پلو سے باندھ لیجئے

اپنی تحریر بھجواتے ہوئے یا ہمیں خط لکھتے ہوئے اپنا پتہ لفافے کی پشت پر لکھنے کو کافی نہ سمجھئے- اپنے ہر خط اور اپنی ہر تحریر کے پیچھے اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھئے-

ادارہ آنکھ مچولی

# یہ دولت کہاں سے آئی

شازیہ فرحین

یہ ایک سچا واقعہ ہے جو ریاست حیدر آباد دکن کے ضلع ورنگل میں پیش آیا اس کے بعض کردار آج بھی زندہ ہیں اور اس واقعے کے گواہ ہیں۔

یہ اس عہد کی بات ہے جب بھارت میں انگریزوں کا اقتدار آخری ہچکیاں لے رہا تھا اور مسلمان کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔

وہ معاشی طور سے ایک بدحال گھرانہ تھا جس کے واحد کفیل ببن میاں تھے۔ اصل نام ان کا کیا تھا، یہ تو بہت کم لوگ ہی جانتے تھے بس وہ عرف عام میں ببن میاں کے نام سے ہی پہچانے جاتے۔

ببن میاں کا گھر غربت کی منہ بولتی تصویر تھا اور پھر کثرتِ اولاد نے ان کی اس غربت میں مزید چار چاند لگا دیئے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک دفتر میں نہایت معمولی درجے کے ملازم تھے۔ تنخواہ بھی

ان کی کوئی خاص نہ تھی کیونکہ ان کی تعلیم بھی ابتدائی نوعیت کی تھی۔

ببن میاں ہر رات سوچ کے سمندر میں ڈوبے رہتے کہ کس طرح اپنے گھرانے کو معاشی طور پر مستحکم کریں کیونکہ اب تو دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر آرہی تھی بچے الگ بھوک سے بلکتے اور بیوی سے ان کا تقریباً روز ہی جھگڑا ہوتا۔

وہ ایک سرد رات تھی جب چاروں طرف ہواؤں کی تند و تیز لہریں ماحول کو خوفناک بنا رہی تھیں اونچے اونچے نیم کے درخت رات کے اندھیرے میں کسی ہیبت ناک دیو کی مانند لگ رہے تھے۔دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی آرہی تھی مگر ببن میاں ان سب سے بے پروا اپنی ہی سوچوں میں گم، مغموم سی صورت بنائے خیالات کے تانے بانے سلجھا رہے تھے رات کافی گزر گئی تھی مگر نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اچانک ہی انہیں یہ محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا ہو۔

"ببن میاں!" اور اب تو کسی نے ان کا نام بھی پکارا تھا وہ دوڑ کر گئے دروازہ کھولا اور باہر کی جانب چل دیئے، کافی دیر یونہی گزر گئی۔ ان کی بیوی بے خبر سو رہی تھی اچانک ہی اس کی آنکھ کھلی اور اپنے قریب کے بستر پر جو نگاہ ڈالی تو ببن میاں کو غائب پایا نظریں سیدھی دروازے پر گئیں جو کھلا ہوا تھا۔

وہ پریشانی کے عالم میں دروازے تک آئی مگر دور دور تک ان کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ اندھیری رات، ہواؤں کا شور، اور ماحول کی خوفناکی سے وہ سخت ہراساں دکھائی دیتی تھی مگر پھر بھی ہمت سے کام لیا اور ببن میاں کے انتظار میں دروازے پر ہی نظریں ٹکا دیں یکایک ہی دور سے کوئی سایہ قریب آتا دکھائی دیا جو ہاتھوں میں کوئی چیز تھامے خراماں خراماں اسی طرف چلا آرہا تھا لالٹین کی مدھم روشنی میں پہچاننے کی کوشش کی اور جب سایہ قریب پہنچا تو جان میں جان آئی کیونکہ یہ ببن میاں تھے جن کے ہاتھ میں بہت سے کوئلے تھے۔

"کہاں گئے تھے؟" بیوی نے غصے سے منہ پھلاتے ہوئے پوچھا مگر ببن میاں خاموش تھے اور کوئلوں کو صحن میں رکھے ہوئے پرانے مٹکے میں ڈال رہے تھے۔

بیوی حیران و پریشان تھی کہ ماجرا کیا ہے کیونکہ ہمیشہ بے تکان بولنے والے ببن میاں کے لبوں پر گویا قفل ڈال دیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ بیوی بے چاری پوچھ پوچھ کر تھک گئی مگر ان کی خاموشی کا پردہ چاک نہ کر سکی۔

ببن میاں کوئلے مٹکے میں ڈالنے کے بعد چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹ گئے جب صبح کا سفیدہ

چاروں سمت پھیل گیا، ببن میاں اپنے بستر سے اٹھے، جلدی سے اس پرانے مٹکے کا ڈھکن اٹھایا اور اندر ہاتھ ڈالا تو حیران رہ گئے کیونکہ کوئلوں کی جگہ سونے کا ڈھیر بکھرا ہوا تھا۔ سونا دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے خوشی سے ان کا چہرہ گلنار ہوا جارہا تھا اور چہرے پر قائم رہنے والی بیزاری رخصت ہو چکی تھی۔

اب انہوں نے ذرا سی بھی دیر مناسب نہ سمجھی اور سونے کو ایک پرانے رومال میں ڈال کر بازار کا رخ کیا، جلد ہی وہ سونا فروخت کر کے ڈھیر سارے روپے لئے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

آج انہوں نے پہلی دفعہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا، بچوں کو بھی پیار کیا اور بیوی کو گھمانے بھی لے گئے۔ ان کی بیوی نے کئی بار استفسار بھی کیا کہ رات کے اندھیرے میں کہاں گئے تھے مگر انہوں نے اس بارے میں کچھ نہ بتایا۔

دوسرے روز بھی رات کو ان کی نظریں دروازے پر جا کر تھم گئیں تھیں اور وہ اس آواز کے انتظار میں تھے جس نے ان کی قسمت کے ستارے کو گردش سے نکال دیا تھا مگر آج آواز کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔

پورا ایک ہفتہ گزرنے کے بعد پھر کسی نے ان کے دروازے پر صرف ایک بار دستک دی اور ان کا نام پکارا، وہ دوڑ کر گئے اور دور جھاڑیوں میں غائب ہوگئے کچھ دیر بعد لوٹے تو ہاتھوں میں وہی کوئلے تھے حسب معمول انہوں نے کوئلوں کو مٹکے میں ڈالا اور صبح کا شدت سے انتظار کرنے لگے صبح ہوئی تو کوئلے پیلے چمکدار سونے میں تبدیل ہو چکے تھے۔

ببن میاں کی تو گویا قسمت چمک گئی تھی ان کے محلے دار اور دوست احباب ان کے یکسر بدلتے ہوئے حالات پر حیران تھے اور ان سے پوچھ پوچھ کر عاجز آچکے تھے مگر اس بات پر ان کی زبان بالکل اسی طرح منجمد ہوجاتی کہ جیسے وہ بے جان ہو۔

آج انہیں اس طرح گھر سے جاتے ہوئے تقریبا دو ماہ ہوگئے تھے اور بیوی ان کے زبان بندی سے سخت نالاں تھی۔

"کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں!" آج تو ان کی بیوی کے جذبات بھڑک اٹھے تھے اور وہ ان سے سخت سے لہجے میں استفسار کر رہی تھی مگر حسب عادت ان کے لبوں پر گہرا سکوت تھا بالآخر بات جب کافی حد تک بگڑ گئی تو ان کے لب دھیرے سے ہل ہی گئے۔

"بیگم وہ ایک جن ہے جس کی پکار پر میں جاتا ہوں۔" انہوں نے یہ کہہ کر اپنی زبان بالکل اس طرح بند کرلی جیسے انہوں نے کسی گہرے راز سے پردہ اٹھالیا ہو، جبکہ ان کی بیوی حیران، پریشان نگاہوں سے انہیں ہی تک رہی تھی اور اس کے بعد اس نے ان سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور خیالوں کی دنیا

میں کھو سی گئی۔

ببن میاں کے گھر میں ہر طرف دولت کی بہار تھی۔ ہر ہفتے کی صرف ایک پکار نے ان کی زندگی کو غربت کی دلدل سے نکال دیا تھا اور اب انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ تپتے صحرا سے نکل کر کسی پُرسکون سائبان میں پہنچ گئے ہوں۔ اب ان کا کچی مٹی کا نامکمل مکان ایک خوبصورت عمارت کا روپ دھار چکا تھا۔ بچے شہر کے مشہور اسکول میں جانے لگے تھے اور بیوی مہارانیوں کی طرح گھر میں بیٹھی نوکروں پر حکم چلایا کرتی تھی جبکہ ببن میاں کی شخصیت میں تو ایک نہیں بلکہ ہزاروں تبدیلیاں آچکی تھیں اب لوگ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے، دوست احباب کا ایک وسیع حلقہ ان کے آگے پیچھے پھرتا مگر کوئی بھی ان کے اس راز سے آشنا نہ تھا جس کی بدولت عیش و عشرت کی خوبصورت زندگی انہیں نصیب تھی۔

" ببن میاں، اب مجھے تمہارے اس طرح رات کو اٹھ کر جانے سے ہول آنے لگا ہے۔ " ان کی بیوی آج ہراساں دکھائی دیتی تھی جبھی اپنے دل کی کیفیت کو کھول کر ان کے سامنے پیش کر رہی تھی۔

"اری پاگل، اسی سے تو ہمارے دن پھرے ہیں۔" ببن میاں اپنی بیوی کی حماقت پر مسکرا رہے تھے۔

"مگر میں تو کہتی ہوں کہ اب ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ ہمارے بچے بھی سکون سے زندگی گزار سکتے ہیں تو پھر اب ہمیں مزید پیسوں کی کیا ضرورت ہے۔" بیوی نے مطمئن سے لہجے میں ان کی طرف دیکھا اور انہیں باز آنے کی تلقین کرنے لگی۔

"لیکن نیک بخت، آئی ہوئی دولت کو روکنا بے عقلی ہے ......" ببن میاں نے دولت کے نشے میں چور ہو کر اسے سمجھایا۔

"مگر یہ ہوس ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہے!" ان کی بیوی کے لہجے میں انجانے اندیشے مچل رہے تھے مگر وہ اس سے بے پروا اپنی ہی خیالی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔

آج کی رات بھی ببن میاں کے لئے خوش نصیبی کی رات تھی اور ان کے کان دستک سننے کے لئے بے تاب تھے مگر اب تک وہ مخصوص دستک نہ سن سکے تھے بے چینی سے وہ بار بار پہلو بدل رہے تھے اور بیوی انہیں باز رہنے کی تلقین کر رہی تھی مگر وہ تو گویا اس کی کوئی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔

اور پھر کچھ دیر بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"ببن میاں" کی زور دار آواز میں کسی نے ان کا نام پکارا اور ان کے قدم کسی غیر مرئی مخلوق کی مانند دروازے سے دور ہوتے گئے اور پھر ان کا دھندلا سایہ بھی جھاڑیوں میں گم ہوگیا۔

رات کا آخری پہر تھا مگر ببن میاں اب تک نہ لوٹے تھے بیوی کا پریشانی کے مارے بُرا حال تھا، آنکھیں خوف سے چھلک رہی تھیں اور دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوتی جارہی تھی۔

اور پھر صبح بھی ہوگئی مگر ببن میاں کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ تھک ہار کر بالآخر ان کی بیوی نے محلے والوں کو اس واقعے کی خبر دے دی تاکہ ان کے بارے میں کوئی پتہ لگایا جاسکے۔

مگر تمام تلاش بے سود ثابت ہوئی کہیں سے بھی ان کا کوئی سراغ نہ لگ سکا بڑے بڑے عاملوں تک سے معلوم کرانے کی کوشش کی مگر کسی کا علم بھی اس معمے کو سمجھنے سے قاصر رہا۔

ببن میاں کہاں گئے اور آج تک کیوں واپس نہ آئے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو آج تک ان کے گھرانے کے لئے معمہ بنا ہوا ہے اور آج اتنے سال گزرنے کے بعد بھی ان کے خاندان کی نظریں اسی دروازے کی جانب ہیں جہاں سے وہ دولت کی ہوس کی خاطر غائب ہوئے تھے وہ اس امید پر ہیں کہ وہ شاید ابھی لوٹ آئیں!

ایسا تو ہونا تھا!

# ایک عجیب و غریب فضائی معمہ

ارم فریدی

یہ ۱۶ اگست ۱۹۴۲ء کا قصہ ہے۔ دن کے پونے گیارہ بجے ایک فوجی جہاز Blimpl-8 کیلیفورنیا کے فورٹ فنسٹن ساحل پر پایا گیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اس میں کسی ذی روح کا نام و نشان تک موجود نہیں تھا۔

زمانہ جنگ میں امریکہ کے مغربی ساحل پر اس قسم کے آبدوز شکن جہاز عام طور پر دیکھے جاتے تھے لہٰذا اس بد قسمت جہاز کی موجودگی ان دو مچھیروں کو حیران نہ کر سکی جو اس وقت ساحل پر موجود تھے تاہم انھوں نے اس لاوارث جہاز کو نکالنے کی کوشش کی لیکن تیز ہوا کے باعث ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ وہ جہاز ایک نوکیلی چٹان کے سرے سے اس انداز سے لگا ہوا تھا کہ ترچھا ہونے کی وجہ سے اس کے اندر موجود تمام آبدوز شکن بارودی مواد نکل کر نیچے گر گیا۔ اس مواد کو عام طور سے Depthcharge کہا جاتا ہے۔ اس چارج کے خارج ہونے کی وجہ سے جہاز کا وزن اتنا ہلکا ہو گیا کہ اوپر اٹھنے کے بعد وہ ہوا کے رخ کے ساتھ جنوب مشرق کی جانب روانہ ہو گیا۔ اور پھر آدھے گھنٹے بعد وہ جہاز سان فرانسکو کے جنوب میں ڈیلی سٹی کی ایک سڑک پر پایا گیا۔ (یہ جہاز چونکہ ایک بڑے غبارے کی شکل کا تھا اور ہوا سے ہلکا ہونے کی خصوصیت رکھتا تھا اس وجہ سے اس نے اتنا سفر طے کیا۔)

اس جہاز کے ملنے کے بعد پہلا سوال یہ اٹھا کہ جہاز کا عملہ کہاں گیا؟ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی بنا پر انھیں جہاز کو چھوڑنا پڑا؟ وہ کیا عوامل تھے جو ان کے مشن کی ناکامی کے باعث بنے؟

ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لئے امریکہ کے تحقیقاتی ادارے نے اس واقعہ کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور تمام قصے کی از سر نو تحقیقات شروع کیں جس کے بعد جو حقائق سامنے آئے وہ کچھ اس طرح تھے کہ Blimpl-8 نے صبح کے تقریباً چھ بجے موفٹ فیلڈ سے ٹیک آف کیا اس جہاز کا عملہ دو افراد پر مشتمل تھا یعنی لیفٹننٹ ارنسٹ ڈی کوڈی اور چارلس ایڈمس جو کہ نہایت معتبر اور تجربہ کار افسران مانے جاتے تھے۔ موسم ابر آلود ہونے کے باوجود قابل پرواز تھا۔ پرواز کے تقریباً دو گھنٹے تک جہاز کا رابطہ کنٹرول ٹاور سے قائم رہا۔ سات بج کر پچاس منٹ پر لیفٹننٹ کوڈی نے کنٹرول ٹاور کو ریڈیو پیغام کے ذریعے مطلع کیا کہ اس نے ایک جگہ سمندر پر تیل کی سطح سی دیکھی جس کے بارے میں اسے تشویش ہے اس نے کہا کہ "میں اس کا قریب سے جائزہ لینے کے لئے جہاز تین سو فٹ نیچے لے جا رہا ہوں۔" اس نے سگنل دیا کہ "اسٹینڈ بائی

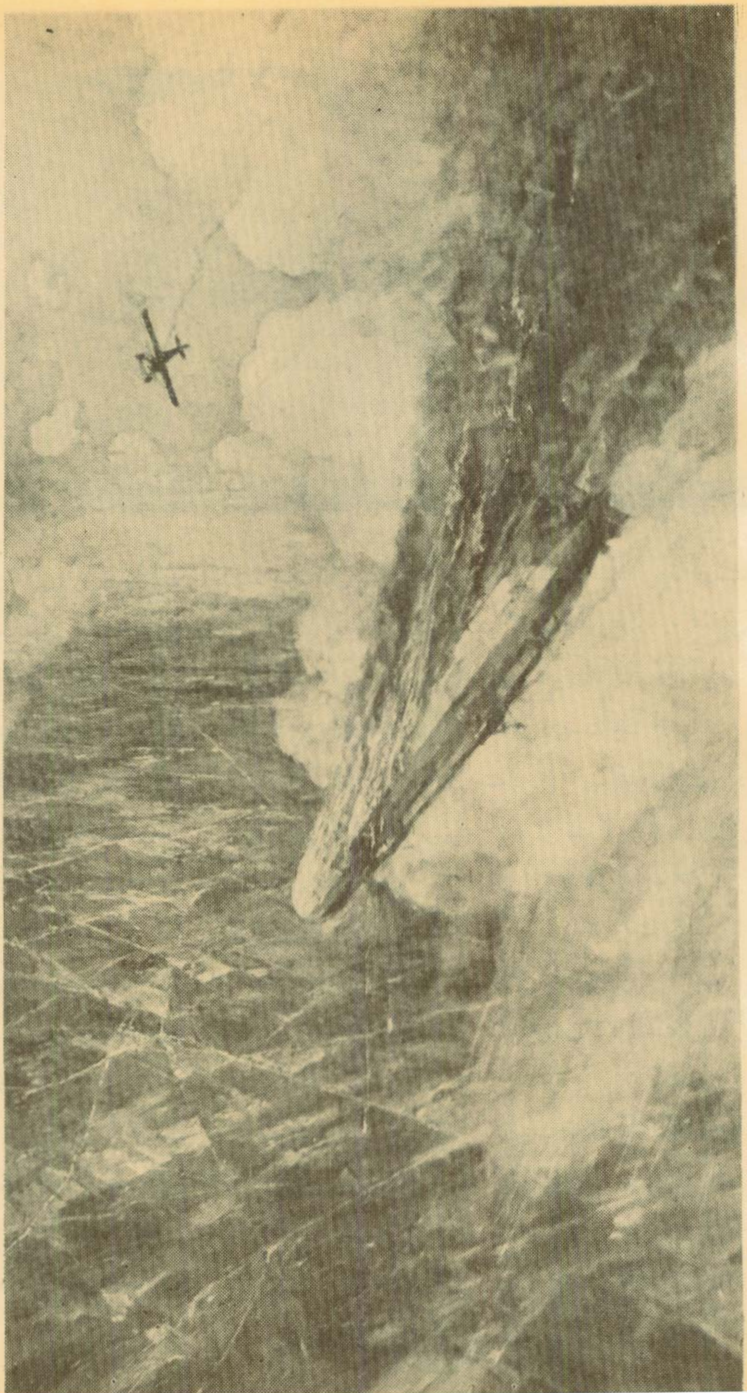

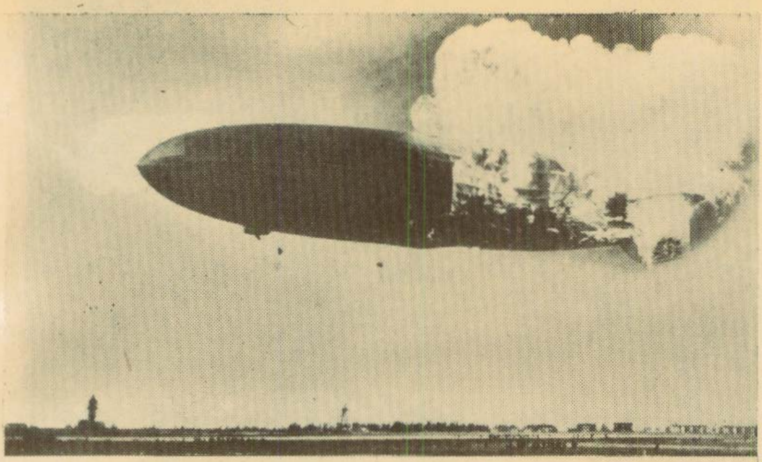

ویو" اس وقت جہاز فیرالون آئلینڈ کے مشرقی حصے سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس پیغام کو سننے کے بعد فوراً دو مسلح کشتیوں کو چوکس کر دیا گیا تا کہ وہ جہاز پر نظر رکھیں۔ وہاں موجود دو مچھیروں کے ٹرالروں نے بھی دیکھا کہ جہاز نیچے کی جانب دائرہ بنا رہا ہے۔ مچھیروں نے یہ دیکھا کہ یہ کوئی آبدوز شکن جہاز ہے لہٰذا انھوں نے سمندر سے اپنے جال کھینچ لئے اور ممکنہ دھماکے کی وجہ سے ایک محفوظ فاصلے پر چلے گئے لیکن انھوں نے دیکھا کہ جہاز نیچے آتے آتے اچانک تیزی سے اوپر کی جانب اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں میں غائب ہو گیا۔ صبح آٹھ بج کر پانچ منٹ پر یعنی اس سے صرف تین گھنٹے قبل جب وہ جہاز ڈیلی سٹی میں پایا گیا کنٹرول ٹاور نے بار بار جہاز سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں ناکامی ہوئی۔ مزید کوششوں کے بعد مختلف جہاز Blimpl - 8 کی تلاش میں روانہ کئے گئے۔ دس بج کر چالیس منٹ پر ایک جہاز نے اچانک بلمپ کی ایک جھلک دیکھی کہ وہ بادلوں میں سے اوپر اٹھا لیکن فوراً ہی دوبارہ بادلوں میں غائب ہو گیا اس کے صرف پانچ منٹ بعد ہی وہ بلمپ ساحل پر پایا گیا جہاں اسے مچھیروں نے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

جہاز ملنے کے بعد جب اس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تو یہ حیرت انگیز بات سامنے آئی کہ جہاز میں موجود تمام آلات اور سامان اپنی متعلقہ جگہوں پر پائے گئے یہاں تک کہ پیراشوٹ اور ربر کے ٹیوب تک موجود ہیں جو کہ کسی حادثے کی صورت میں جان بچانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ تمام سامان میں صرف دو زرد رنگ کی لائف جیکٹیں ایسی تھیں جو کہ غائب تھیں لیکن ان کی غیر موجودگی کا ایک واضح جواز موجود

تھا وہ یہ کہ سمندر کے اوپر سے گذرتے وقت جہاز کے پائلٹ اور تمام افراد کو لائف جیکٹیں پہننے کی اجازت ہوتی ہے اور چونکہ لیفٹننٹ کوڈی اور ایڈمس بھی اس وقت سمندر کے اوپر پرواز کر رہے تھے لہٰذا لائف جیکٹوں کی غیر موجودگی اس معمہ کو حل کرنے میں کوئی مدد نہ کر سکی۔

جہاز مکمل طور سے تسلی بخش حالت میں تھا اس کی کوئی چیز تباہ یا خراب نہیں ہوئی تھی یہاں تک کہ جہاز کے نچلے تختے بھی صحیح سالم پائے گئے۔ جہاز کی موٹر تو بند تھی لیکن اس کا نہ صرف اگنیشن سوئچ کھلا تھا بلکہ دونوں Throttle کھلے ہوئے تھے جو رفتار کو کم اور زیادہ کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

جہاز کے کھلے ہوئے دروازے اور کوڈی کے پیغام کے بعد اچانک پرواز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاز کے دونوں افسران سمندر میں گر گئے ہوں گے یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ ایک افسر گرنے لگا ہوگا اور دوسرا جب اس کی مدد کو آیا ہوگا تو جہاز پر توازن بگڑنے کے باعث دونوں گر گئے ہوں گے لیکن تھروٹل کی پوزیشن اس خیال کی تردید کرتی ہے کیونکہ اگر ایک پائلٹ اپنے ساتھی کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا تو جہاز کی رفتار اتنی تیز کیوں تھی جو کہ ایک تھروٹل کے پورا اور ایک کے آدھا کھلا ہونے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جب جہاز تیل کے معائنہ کے لئے نیچے آیا تو وہاں کئی افراد موجود تھے ان کے بیان کے مطابق نہ انھوں نے کسی کو گرتے دیکھا نہ پانی میں کسی کے گرنے کی آواز سنی اور نہ ہی زرد لائف جیکٹوں کی کوئی جھلک دیکھی۔ ایک طویل تلاش کے بعد بھی نہ ان افسران کی لاشیں مل سکیں اور نہ لائف جیکٹوں کا کوئی سراغ۔ جہاز کے نچلے تختے میں پانی کی غیر موجودگی اس بات کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ جہاز نے کسی بھی وقت سمندر کی سطح کو نہیں چھوا یہ بات اس خیال کی تردید کرتی ہے کہ Blimpl-8 کے افسران کو جاپانیوں نے قیدی بنالیا ہو گیا جو اس وقت وہاں اپنی آبدوزوں میں سفر کر رہے تھے لیکن جنگ کے خاتمے کے بعد جاپان کے ذرائع نے بتایا کہ اس واقعہ کے وقت وہاں کوئی جاپانی آبدوز موجود نہیں تھی۔

اس دن کے بعد سے آج تک یہ پتا نہ چل سکا کہ لیفٹننٹ کوڈی اور چارلس ایڈمس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔ جب سے انسان نے فضا میں پرواز کرنا شروع کیا ہے اس طرح کے کئی واقعات انسان کی تشویش کا باعث بنے ہوئے ہیں کبھی جہازوں کی اچانک تباہی، حیرت انگیز طور پر اس طرح لاپتہ ہو جانا کہ ان کا نام و نشان تک نہ ملے کئی افراد کی موجودگی میں پائلٹوں کا غائب ہو جانا بغیر کسی وجہ کے مسافروں کا جہازوں سے کود جانا ایسے عجیب و غریب واقعات ہیں جو فضائی سفر میں پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ان عجیب واقعات میں عجیب ترین ہے۔ آپ بھی اس نہ سمجھ میں آنے والے فضائی معمے کے بارے میں سوچئے کہ آخر صحیح سالم جہاز کی موجودگی میں لیفٹننٹ کوڈی اور چارلس ایڈمس کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا!

# ایک دن میں کہانی لکھنا سیکھئے

محمد عمران شیخ

پیارے ساتھیو! اگر آپ نے ابھی تک کوئی کہانی نہیں لکھی ہے لیکن لکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمارا یہ مضمون ضرور پڑھئے کیوں کہ اس کو پڑھنے کے بعد آپ قلمکار بن جائیں گے۔ سب سے پہلے تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ میں کہانی لکھنے کی بھرپور صلاحیتیں موجود ہیں بس انہیں ذرا پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ پھر آپ ایک بہترین ادیب نہیں تو ادیب ضرور بن جائیں گے۔ بس آپ میں کہانی لکھنے کا شوق موجود ہونا ضروری ہے بلکہ یہ ایک لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر آپ کہانی نہیں لکھ سکتے۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہیں۔ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے جلدی سے کاپی قلم اٹھائیے اور نیچے دیئے گئے آزمودہ طریقوں کی مدد سے کہانی تیار کیجئے۔ لیکن کہانی لکھنے کا فن سکھانے سے پہلے آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ کہانیوں کی بھی مختلف اقسام ہوتی ہیں مثلاً سچی کہانی، شرارتی کہانی، جاسوسی کہانی، غمگین کہانی وغیرہ وغیرہ۔ کہانیوں کی ویسے تو کئی قسمیں ہیں لیکن ہم آپ کو دو طرح کی کہانیاں لکھنے کے طریقۂ کار کے بارے میں بتائیں گے۔

ہاں تو سب سے پہلے یہ سنئے کہ ایک شرارتی کہانی لکھنے کا طریقۂ کار کیا ہے؟ یہ ضروری نہیں کہ آپ نے بچپن میں کوئی شرارت سرانجام دی ہو جس پر آپ اپنی کہانی کے پلاٹ کو پروان چڑھائیں۔ آپ کو تو صرف کہانی لکھنی ہے جس کی شروعات آپ اس طرح کیجئے کہ دو یا تین دوست تھے۔ ان کے نام آپ اپنے دوستوں یا بہن بھائیوں پر رکھ لیں تو کہانی کی کہانی اور بہن بھائیوں کی خوشی بھی۔ اب آپ ان تین دوستوں کی شرارتوں کے متعلق لکھئے کہ اسکول سے واپسی پر وہ آم کے باغ میں چلے جاتے ہیں اور خوب

سارے آم توڑ توڑ کر کھاتے ہیں۔ لیجئے آپ تو خوامخواہ سوچ میں پڑ گئے کہ مالی کہاں مر گیا تھا............ وہ باغ میں کیوں نہیں تھا۔ بھئی دیکھئے اگر آپ ان سوالوں کے چکروں میں پڑ گئے تو کہانی ادھوری رہ جائے گی اور قارئین ایک اچھی کہانی پڑھنے سے محروم رہ جائیں گے۔ لہٰذا آپ ان تینوں دوستوں پر باغ کے دروازے کھول دیجئے اور پھر اطمینان سے لکھئے کہ تینوں دوست آم کے درخت پر چڑھ گئے اور مزے لے لے کر آم کھانے لگے۔ افوہ آپ کا تیز رفتار ذہن پھر اس سوچ و بچار میں کھویا ہوا ہے کہ انہیں آم درختوں پر کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ انہیں توڑ کر جمع بھی تو کر سکتے ہیں اور پھر کسی محفوظ مقام پر جا کر کھا سکتے ہیں۔ اگر آپ اس فلسفہ میں الجھ گئے تو پھر کہانی تو ہو چکی تیار۔ آپ فوراً ان غیر ضروری سوچوں کے سمندر سے نکل آیئے اور کہانی کو اس کے اصل انجام تک پہنچانے کے لئے کوشاں رہئے۔ ہاں تو پھر لکھئے کہ تینوں دوست مالی کے ہاتھوں پکڑے گئے اور مالی نے ان کی شکایت باغ کے مالک سے کر دی اور مالک نے جی بھر کے ان کی خاطر تواضع کی بھئی آموں سے نہیں ڈنڈوں سے۔ آپ نے تو حد کر دی آپ ان بیچارے معصوم دوستوں کو باغ کے مالک کے ذریعے پولیس کیس میں الجھانے کی سوچ رہے ہیں۔ پلیز بچوں پر ایسا ظلم نہ کیجئے اور صرف یہ لکھئے کہ انہوں نے آئندہ شرارت سے توبہ کر لی اور اپنی کہانی کا اختتام کر دیجئے۔

یہ تو ہم نے آپ کو ایک شرارتی کہانی سپردِ قلم کرنے کا طریقہ بتایا ہے لیکن اگر خدانخواستہ کہانی پسند نہ آئی ہو تو مایوس نہ ہویئے۔ ہم آپ کو ایک دوسری کہانی لکھنے کا طریقہ بتلاتے ہیں انشاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

اس نئی کہانی کے اہم کرداروں میں ایک عدد بادشاہ اس کی چہیتی شہزادی، ایک عدد جن اور کسی بھی دوسرے ملک کا ایک عدد شہزادہ شامل ہیں۔ ارے آپ تو ابھی سے پریشان ہو رہے ہیں۔ ہم آپ کو کھانا پکانے کی ترکیب ہر گز نہیں بتا رہے ہیں بلکہ اب ہم بادشاہوں والی کہانیوں کے طریقۂ کار کے متعلق بھینس اوہ سوری بحث کریں گے تو آیئے فالو فرمایئے۔

اس قسم کی کہانی میں لکھئے کہ کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ ارے ملک کا نام وام بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ''کسی'' سے ہی کام چل جائے گا۔ خیر بادشاہ بڑا رحم دل اور انصاف پسند تھا۔ بظاہر تو یہ بات غیر یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو پورے ملک کا حکمران اور دوسری طرف رحمدل اور انصاف پسند، لیکن آپ ان باتوں سے بے نیاز آگے بڑھتے جایئے کہ اس کی ایک پیاری سی چہیتی شہزادی ہے۔ پھر شہزادی کا کوئی اچھا سا نام تجویز کر لیجئے مثلاً گلابو شہزادی، نیلوفر شہزادی یا اچھا سا کوئی اور............ پھر اسے ایک دن باغ کی سیر کرانے لے جایئے جہاں سے اسے ایک جن اغوا کر کے لے گیا جو شہزادی کو قید

کردے گا اور اسے شادی کرنے پر مجبور کرے گا۔ پھر آپ بادشاہ اور ملکہ کا دکھ اور درد کی مٹی میں اٹا ہوا حال بیان کیجئے۔ ایسے حالات میں یقیناً آپ کو یہ لکھنا پڑے گا کہ آخر کار بادشاہ نے پورے ملک میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ "جو ہماری شہزادی کو جن کی قید سے آزاد کرائے گا اس کی شادی شہزادی سے کردی جائے گی۔ علاوہ ازیں اس کو آدھی سلطنت کا وارث بنا دیا جائے گا۔"

اس صورتِ حال کے بیچوں بیچ یقیناً کسی دوسرے ملک کے شہزادے کا کباب میں ہڈی بن کر ٹپکنا ضروری ہے لہٰذا اپنی کہانی میں شہزادے کو لے آیئے۔ پھر شہزادے کے سفر کے حالات اور سفر کے دشوار گزار مراحل کو دلچسپ انداز میں بیان کیجئے۔ اور جب شہزادہ کے پاس کھانے پینے کا سامان ختم ہو جائے تو بلا تاخیر یہ قلمبند کر دیجئے کہ شہزادے کو ایک جھونپڑی دکھائی دی جہاں ایک بزرگ عبادت میں مشغول تھے۔ انہوں نے نہ صرف شہزادے کو کھانا کھلایا بلکہ یہ بھی بتایا کہ شہزادی فلاں پہاڑ کے فلاں دامن میں ایک جن کے قبضے میں موجود ہے۔ ان حالات میں بزرگ شہزادے کی مدد ضرور کریں گے اور اسے ایک عدد تلوار سے نوازیں گے۔ ارے آپ پھر یہ سوچ رہے ہیں کہ شہزادے کے پاس پہلے سے بھی تو تلوار موجود ہوگی، پھر بزرگ کو تلوار دینے کی کیا ضرورت، خیر کسی کی سوچ پر تالا تو نہیں لگایا جا سکتا نا۔ بھئی دراصل بزرگ کی تلوار طلسماتی تلوار ہوگی جس سے جن کا جادو شہزادے پر اثر انداز نہیں ہوگا اور ہاں ایک عدد قالین کا بھی ذکر کر دیجئے جس پر بیٹھ کر شہزادہ جن کے پاس پہنچ جائے گا۔ آپ پھر یہ سوچنے لگے کہ کیا وہ جادوئی بزرگ تھے؟ اور ان کے قالین کے بارے میں تو یہ سفید جھوٹ ہے، لیکن جناب اس قسم کی ہوائی باتوں سے آپ کی کہانی میں چار چاند لگ جائیں گے۔ اچھا اب جلدی سے شہزادے کو جن کے پاس پہنچا دیجئے اور شہزادے اور جن کا آمنا سامنا کرا دیجئے اور پھر لکھئے کہ جن شہزادے کو خونخوار بھیڑیئے کی طرح گھور رہا ہے، اس کی گردن میں مختلف اقسام کے سانپ اور بچھو ہیں اور جن کے منہ سے آگ کے دہکتے انگارے برس رہے ہیں اور جن کی تین آنکھیں ہیں۔ دو تو ایسی جیسی سب کی ہوتی ہیں اور ایک آنکھ آپ حسب مرضی فٹ کر دیجئے۔ ویسے پیشانی پر جچے گی۔ خیر یہ تو ہوگا جن صاحب کا حلیہ۔ اب دونوں کی لڑائی کے خوفناک پہلوؤں کو الفاظ کے سمندر میں ڈبو کر اس طرح پیش کیجئے کہ قاری سسپنس میں مبتلا ہو جائیں لیکن آخر میں آپ کو ہر حال میں شہزادے کو ہی جتوانا ہے ورنہ آپ کا کیا دھرا سب خاک میں مل جائے گا۔ ہاں، پھر یہ لکھئے کہ شہزادے صاحب شہزادی کو لے کر "کسی" ملک میں واپس آگئے جہاں ان کی خوب دھوم دھام سے شادی ہوئی اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

لیجئے جناب بادشاہوں والی کہانی کا اختتام ہوا۔ اگر آپ اتنی آسان کہانی بھی نہ لکھ سکے تو سمجھ لیجئے کہ یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔ جائیے اور کوئی ڈھنگ کا کام تلاش کیجئے۔

ترجمہ: محمود شاہد

میں نے موٹی کتاب سے سر اٹھایا اور نیلسن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک اوسط عمر کا شخص تھا مگر اس کی خستہ حالی اور لٹکا ہوا چہرہ اس کی الجھن کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ اس کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ تھیں۔ شاید وہ کئی راتوں سے سویا نہیں تھا۔ وہ بار بار مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

"جی فرمایئے ...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے چہرے پر مسکراہٹ سجا کر خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"میں ایک بہت بڑی الجھن کا شکار ہوں۔" لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے جواب دیا۔ "میں اسی الجھن کے زیر اثر کئی راتوں سے سویا نہیں نہ کچھ کھایا پیا ......"

"آپ مطلب کی بات کیجئے مسٹر نیلسن!" میں نے اس کی لمبی تمہید سے تنگ آکر کہا۔ میں ایک سراغ رساں تھا اور میری شہرت کا سکہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا ظاہر ہے ایسی صورت میں میرے پاس

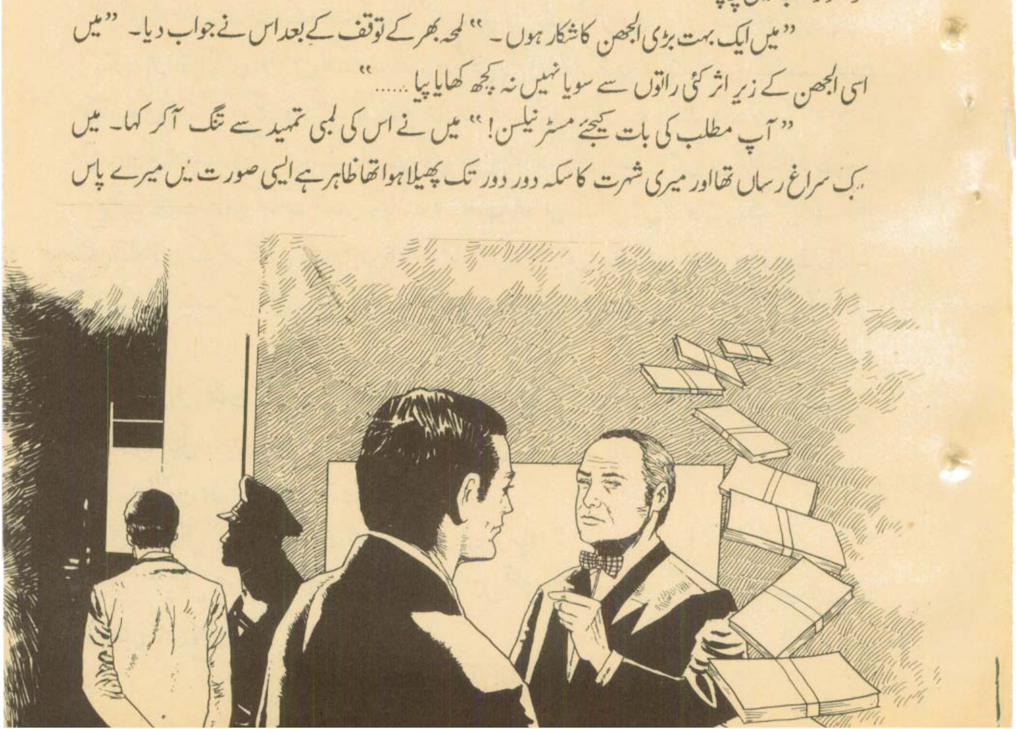

کوئی خستہ حال شخص ہی آئے گا۔

**جون** میرا بہت گہرا دوست تھا......" اس نے چند ثانیوں کے بعد کہا۔ "وہ بچپن سے میرا دوست تھا اور ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے دل و جان سے......یہی وجہ تھی کہ میں نے اس پر اتنا بڑا اعتماد کرنے کا فیصلہ کرلیا......!" ایک لمحے کے بعد اس نے گہرا سانس لیا۔

"میں قالینوں کا کاروبار کرتا ہوں...... کاروبار کے سلسلے میں مجھے ایران کا سفر کرنا پڑا......مگر سب سے بڑا مسئلہ میرے پاس موجود نقدی تھی ...... "دس لاکھ" ...... یقیناً یہ کوئی چھوٹی رقم نہیں ...... اور اسے محفوظ جگہ پر رکھنا بہت ضروری تھا۔"

میری نظر انتخاب جون کی طرف اٹھی۔ رات کے وقت میں نے تمام نقدی اس کے حوالے کی اور صبح سفر پر کمر باندھی۔"

"آپ کو یہ رقم کسی بینک میں جمع کرانی چاہئے تھی مسٹر نیلسن۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں اس سے کہا۔

"آپ کی بات بجا ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "مگر رقم کی کسی بھی وقت مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی پھر ظاہر ہے رات کے وقت بینک کھلا نہیں ہوتا۔" مجھے مطمئن دیکھ کر اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں وہاں پہنچا تو یہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ شخص رقم کی تکرار کر رہا تھا پہلے تو میں نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر وہ قطعی ماننے پر تیار نہ تھا۔ مجبوراً رقم کے واسطے مجھے واپس آنا پڑا۔ ایک دن کی مہلت دی تھی اس نے۔ اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ایک دن میں اس کا ایک لاکھ روپیہ نہ پہنچا تو وہ میرے کاروبار کو بہت نقصان پہنچائے گا۔ سب کچھ اس کے بس میں تھا اور میں بے بس تھا۔ تاہم میں نے جون کے گھر کا رخ کیا۔ رات کا وقت تھا۔ اس وقت میں اپنے حسن انتخاب کو داد دے رہا تھا۔ اگر یہ رقم بینک میں جمع ہوتی تو آپ آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ رقم مجھے فوراً نہ مل سکتی تھی۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر جون باہر نکلا تو اس کا چہرہ حیرت انگیز حد تک سپاٹ تھا، میں نے چہرے پہ مسکراہٹ سجائی اور بازو پھیلا کر اسے گلے لگانا چاہا مگر اس نے میرے بازو جھٹک دیئے۔

"کون ہو تم؟" وہ درشت لہجے میں بولا۔

"مذاق ...... تم اس وقت بھی مذاق کر رہے ہو کیا!!"

"بالکل نہیں ......" اس نے جواب دیا "میں قطعی سنجیدہ ہوں ...... مگر آپ صاحب ہیں کون ...... میں نہیں پہچان سکا......!"

"عجیب آدمی ہو تم!" میں نے ہنس کر کہا۔ "میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں مذاق کی، سوجھی ہے......"

"میں سنجیدہ ہوں مسٹر......!" وہ سخت لہجے میں بولا۔" جانے تم کون ہوں، رات کا ایک بجا ہے۔ صبح ملنا...... ورنہ سنتری یا چوکیدار میری آواز سے زیادہ دور نہیں ہوں گے!" اس نے جھٹک کر دروازہ بند کر دیا۔

میں حیرت زدہ رہ گیا۔ مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ صرف مذاق ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد جون مسکراتا ہوا دروازہ کھولے گا اور مجھے گلے سے لگا کر اندر لے جائے گا۔ مگر وہ باہر نہ آیا۔ لمحے نہیں گھنٹے بیت گئے اور باوجود دستک کے اس نے دروازہ نہ کھولا...... میرے ذہن میں شکوک و شبہات جنم لینے لگے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جون کی محبت اور دوستی دس لاکھ کے عوض بک چکی ہے، دولت کی چمک سے اس کی آنکھیں ماند ہو گئی ہیں۔ اس کا یہ روپ میرے لئے ناقابل یقین تھا۔ وہ ایسا تو نہ تھا۔ میرے دل و دماغ غم کے بوجھ سے پھٹنے لگے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک ریلا بہہ نکلا اور میں تھکے تھکے قدموں کے ساتھ واپس ہو لیا۔"

"ممکن ہے مسٹر نیلسن...... اس نے آپ کو نہ پہچانا ہو...... دیکھئے نا آپ کہہ رہے تھے کہ رات کا وقت تھا۔" میں نے نرم آواز میں کہا۔

اس شخص سے مجھے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی اس نے اشک آلود آنکھیں صاف کیں اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا...... "یہ خیال بھی میرے دل میں آیا تھا مگر گلی میں لگا بلب بالکل اس کے دروازے کے اوپر تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اتفاق تھا۔ اور اس میں ہاتھ تو کیا ہاتھ کی چھوٹی چھوٹی لکیریں بھی نظر آتی تھیں...... اگر ایک لمحے کے لئے میں آپ کی بات درست جان لوں تو اس نے دن کے وقت مجھے کیوں نہیں پہچانا بلب کی روشنی میں اگر اسے کچھ نظر نہ آیا تو وہ سورج کی روشنی میں کیوں نہ دیکھ سکا! میں نے اسے بار بار کہا کہ دوست! اگر یہ رقم تمہیں ضرورت ہے تو تم مانگ لیتے خدا گواہ! میں کبھی انکار نہیں کرتا...... مگر اس نے جواب دیا...... "کونسی رقم......!"

"آپ نے گواہ نہیں لیا تھا...... کوئی ایک......!!!"

"میں نے بھروسہ کیا تھا اس پر...... اس کی دوستی پر...... ایک خدا دیکھ رہا تھا اور ہم دونوں تھے۔ میں نے راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی۔ مگر جب اسے سنگدل دیکھا تو میرے اندر آتش انتقام بھڑک اٹھی۔ میں نے اس پر مقدمہ دائر کر دیا...... مگر میں ہار گیا۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا، نہ گواہ نہ تحریر۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی بڑی غلطی کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ میں سب کچھ ہار گیا...... اور

آج میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہوں اسے تو یہ ثبوت مل گیا کہ ایرانی تاجر کی رقم میں اس پہ الزام دھر کر پوری کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے مجھے چھ ماہ کی سزا اور پانچ ہزار روپے جرمانہ دینا پڑا ......"

"واقعی صورتحال بہت پیچیدہ ہے!" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور ملتجی لہجے میں بولا۔ "میرے ارد گرد گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے ...... اور آپ واحد روشنی کا چھوٹا سا نقطہ۔ آپ کے بجھتے ہی میں بھی بجھ جاؤں گا ...... میں جس کے پاس گیا اس نے فقط جواب دیا "آپ دس لاکھ روپوں کو بھول جائیں!!" مگر مجھے امید ہے کہ آپ ایسا جواب ہرگز نہیں دیں گے۔"

پھر وہ میز پر کہنیاں ٹکا کر بولا۔ "اگر آپ یہ کیس جیت جائیں تو میں تمام رقم آپ کو دینے کے لئے تیار ہوں میں صرف جون کی آنکھوں کے سامنے سے لالچ کا پردہ نوچنا چاہتا ہوں۔ میں اس کے پاؤں تلے سے زمین نکالنا چاہتا ہوں ......"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا ...... لیکن چند ہی لمحوں کے بعد میری آنکھوں میں چمک آگئی ...... میں نے فوراً کاغذ اور قلم اٹھا کر نیلسن کے حوالے کئے۔ میری حالت دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بھی نارمل ہو گیا تھا۔

"لکھو ......!" میں نے سگریٹ جلایا اور پر خیال لہجے میں بولا ...... نیلسن قلم سنبھال کر تیار ہو گیا۔

"پیارے دوست جون!

آداب!

مجھ پہ ستم بہت ہو چکا۔ مجھ میں ذرہ بھر بھی قوت مدافعت نہیں۔ خدارا مجھ پہ رحم کرو۔ میری مجبوریوں اور بے بسی سے فائدہ مت اٹھاؤ۔ تم اگر چاہو تو ہم وہی پہلی والی دوستی، خلوص اور محبت کی عمارت استوار کر سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے بارہ لاکھ مجھے پہنچا دو گے!"

تمہارا
نیلسن

تمام تحریر مکمل کرنے کے بعد نیلسن نے میری جانب الجھن بھری نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "مگر یہ رقم دس لاکھ تھی ......!!"

"آپ صرف دیکھتے جائیں مسٹر نیلسن خدا کرے گا تو ہمیں ضرور کامیابی نصیب ہوگی!"

"میری امیدیں صرف آپ سے وابستہ ہیں!" وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا۔

"یہ خط پوسٹ کر دو!" میں نے اگلی ہدایت کی۔ "اور جونہی جواب ملے ...... میرے پاس آنا

میں آپ کا انتظار کروں گا۔ بہت بے چینی کے ساتھ!!"

اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

دو دن مصروفیات میں اس قدر ڈوب گئے کہ پتا تک نہ چلا...... تاہم نیلسن کو میں بھولا نہیں تھا یہ میری زندگی کا دلچسپ کیس تھا۔ جس میں مجھے کامیابی کی امید بھی تھی اور ناکامی کا ڈر بھی!!!"

وہ شام کا وقت تھا۔ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور نیلسن اندر داخل ہو گیا۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے آتے ہی بند لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"میرا نام نیلسن ہے اور ......" اس نے آتے ہی تعارف کرانا چاہا۔

"بھلا میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں مسٹر نیلسن۔"

"شکریہ سر!"

"میں نے خط کھولا ...... اور خط پڑھتے ہی میری آنکھوں میں چمک آ گئی ...... مجرم چاہے کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو۔ اس سے کوئی نہ کوئی غلطی ضرور سرزد ہو جاتی ہے۔ وہ ایسے نشانات ضرور چھوڑ جاتا ہے، جو اس کے تعاقب میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

"مبارک ہو آپ کو مسٹر نیلسن! کیس پلٹ گیا ہے۔ دس لاکھ کا ثبوت آپ کو مل گیا ہے۔ یہ رہا وہ ثبوت!" میں نے خط اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بے تابی سے خط پڑھا۔ مگر چہرے کے تاثرات مایوسی میں بدل گئے۔

"یہاں صرف ایک بات کا ذکر ہے کہ "تم نے مجھے بارہ لاکھ نہیں دس لاکھ روپے دیئے ہیں۔ اور انہیں بھی بھول جاؤ ...... ہم ایک دوسرے سے بہت دور آ چکے ہیں۔" "دس لاکھ!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اس نے اقرار کر لیا ہے کہ آپ کے دس لاکھ اس کے پاس ہیں۔ گویا تحریری ثبوت! اور اب مقدمہ جیتنے سے آپ کو کوئی نہیں روک سکتا......"

"یقیناً یقیناً اوہ خدایا یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" وہ خوشی سے چلّا اٹھا۔ اس نے خط کو چوما اور دیوانہ وار بھاگ گیا۔ تسکین کے احساس نے اسے اتنی خوشی دی کہ وہ مجھے سلام کرنا ہی بھول گیا۔

ہفتہ بھر کے بعد وہ پھر میرے دفتر میں آیا...... یہ واقعہ میرے دماغ پر دھندلا سا گیا تھا۔ مگر نیلسن کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں!" وہ چہک کر بولا۔ "میرا نام نیلسن ہے......" اس نے مصافحہ کیا اور کرسی پر بے تکلف ہو کر بیٹھ گیا۔

اس کی حالت بہت بہتر تھی۔ بالوں پہ خوبصورتی سے کنگھا کیا گیا تھا۔ عمدہ لباس زیب تن تھا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں کہ اس دن میں آپ کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔" اس نے گفتگو کا آغاز کیا "مگر یہ بات بھی نہیں کہ میں اپنے عظیم محسن کو بھول گیا۔ میں نے ہر سانس کے ساتھ آپ کو یاد رکھا...... مگر دیکھئے وعدہ کے مطابق میں دس لاکھ روپے لے کر حاضر ہو گیا ہوں ثبوت کے مہیا ہوتے ہی وہ ہار گیا......!!! اس کا شرمسار چہرہ دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی۔

یہ کہہ کر اس نے بریف کیس میرے سامنے میز پر رکھ کر کھول دیا۔ وہ سرخ سرخ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ پھر میں نے نیلسن کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر بہت مسرت تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک پر خلوص شخص تھا ایک سادہ لوح شخص...... میں نے مسکرا کر بریف کیس بند کیا اور اس کی جانب کھسکا دیا۔

"محبت پیار اور خلوص کی کوئی قیمت نہیں ہوتی مسٹر نیلسن" میں نے متانت سے جواب دیا۔ "پہلے دن ہی آپ کو دیکھ کر میرے اندر محبت کے جذبے نے جگہ پیدا کر لی تھی۔ آپ جائیں کاروبار کریں اس رقم سے، خدا آپ کو ترقی دے ...... پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں!"

"آپ بہت عظیم انسان ہیں......" وہ سسکاری لے کر بولا۔ اس کے ساتھ ہی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ مجھے معلوم تھا اس پر محبت کا جنون سوار ہے...... وہ ایک خالص آدمی تھا۔ جو عیاری اور مکاری نہیں جانتا تھا۔

میں نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا...... اس کے اشک تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے!!!

---

# پڑوسن

**ایک عورت** نے اپنی پڑوسن سے ایک کتاب پڑھنے کو مانگی اس نے جواب دیا "بہن میں کتاب دیا نہیں کرتی آپ جتنی چاہیں یہاں بیٹھ کر مطالعہ کر لیں۔" چند روز بعد اب پڑوسن اس عورت کے پاس گئی اور جھاڑو طلب کی تو اس نے جواب دیا

"بہن! میں کسی کو جھاڑو نہیں دیا کرتی آپ یہاں آکر میرے گھر میں جتنی چاہیں جھاڑو دے لیں۔"

محمد عبداللہ راولپنڈی

# کمسن قلم کار

## لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آپ اگر واقعی کمسن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کیلئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہو سکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلمکار کا نام پتہ درج نہ ہو گا اسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کمسن قلمکار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلمکار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کمسن قلمکار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔ (ادارہ)

## نعت

مرسلہ: سید فیصل نعمان گیلانی

مدینے کی مہکی بہاروں میں گم ہوں
میں گنبد کے رنگیں نظاروں میں گم ہوں
میں گم ہوں سلاموں کی پیہم صدا میں
اذانوں کی دل کش پکاروں میں گم ہوں

مرے عالمِ شوق کا پوچھنا کیا
مجھے جو ملے ان سہاروں میں گم ہوں
یہ اقبال عشقِ نبی ﷺ کا کرم ہے
میں کالی گھٹا کے نظاروں میں گم ہوں
جہاں سے بھی گزرے تھے شانِ دو عالم ﷺ
میں اقبال ان رہ گزاروں میں گم ہوں

# بڑا کام

محمد تنویر شعیب

کاشف اور ایاز دادا جان کے کمرے میں داخل ہوئے تو دادا جان کو نماز پڑھنے میں مصروف پایا وہ دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے کہ کب دادا جان نماز سے فارغ ہوں۔ آخر دادا جان نے سلام پھیرا اور بعد میں دعائیں وغیرہ مانگنے کے بعد وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں تو بچو تم آگئے ............!"

"ہاں دادا جان ہم تو آگئے ...... مگر آپ نے بلایا کس لئے تھا۔"

"بھئی تم لوگ کہو تو اگلے جمعے کو پکنک پر چلیں ...... ذرا ہمارا دل بھی چاہ رہا تھا اور تھوڑی سی تفریح بھی میسر آئے گی۔"

"کیا واقعی دادا جان ......؟" کاشف نے تعجب سے کہا۔

"ہاں بھئی ...... لیکن اس کے لئے تم کو ہماری ایک شرط ماننا پڑے گی۔"

"وہ کیا ......؟" اس بار ایاز بولا۔

"شرط یہ ہے کہ تم دونوں اس ہفتے کسی سے بھی نہ جھگڑو گے اور نہ ایسی شرارت کرو گے جس سے کسی کو تکلیف پہنچے ............ بتاؤ منظور ہے ......؟"

وہ دونوں کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر ایک دم بول پڑے۔ "جی منظور ہے۔"

"اور اس کے علاوہ تم دونوں کے درمیان ایک مقابلہ بھی ہے ......"

"کیسا مقابلہ دادا جان ......؟" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"بھئی ہفتے بھر تم دونوں میں جو سب سے زیادہ

نیکیاں کرے گا وہی انعام کا حقدار ہوگا ...... بولو منظور ہے ......؟" دادا جان نے ایک بار پھر کہا تو وہ دونوں بولے۔

"جی منظور ہے ...... مگر انعام کیا ہوگا ......؟"

"بھئی اس کو چھوڑو ...... انعام ایسا ہوگا کہ تم دیکھتے رہ جاؤ گے ......" اس کے بعد وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

دراصل دادا جان نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا کہ گھر کے تمام افراد ان دونوں کی شرارتوں سے بہت تنگ تھے۔ کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا تھا کہ جب یہ دونوں مل کر کسی کو تکلیف نہ دیتے ہوں ...... ہر وقت لڑائی جھگڑے میں مصروف، گھر میں کسی کا کہنا نہ مانتے تھے۔ ایک صرف دادا جان ہی تھے جن کا ڈر ان دونوں کو تھا۔ گھر کے ہر شخص نے ہر طرح کی تدبیر کر کے دیکھ لی مگر یہ دونوں اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر کے دیکھ لیا، مار کر دیکھا، پیار سے سمجھایا مگر بے سود۔ آخر دادا جان کو یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ ان کو انعام کا لالچ دے کر نہ صرف ان کو بری حرکتوں سے باز رکھا جائے بلکہ ان سے اچھے کام بھی کروائے جائیں۔

ہفتہ گزرنے میں صرف ایک دن باقی تھا، ان چھ

دنوں میں کاشف نے کیا کیا نہ کیا تھا کئی معذوروں کو سڑک پار کروائی تھی، مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا تھا، نمازیں پڑھیں...... روزے رکھے اور اس ایک ہفتے میں اس نے کسی کو بھی تنگ نہ کیا، جبکہ ایاز پریشان تھا کیونکہ اس نے ایک ہفتے میں کوئی بھی قابل ذکر نیکی سرانجام نہیں دی تھی۔

آج جمعرات کا دن تھا۔ ایاز اسکول سے لوٹ رہا تھا۔ وہ راستے میں پڑے پتھروں کو اپنے جوتے سے ٹھوکریں لگاتا جارہا تھا اور ساتھ ساتھ سوچتا بھی جارہا تھا کہ اس نے اب تک کوئی قابل ذکر نیکی کیوں نہ انجام دی...... "کل دادا جان کے سامنے کیا جواب دوں گا" وہ بڑبڑایا۔ وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اچانک وہ اس پہاڑی پر چڑھنے لگا اس کو خود پتہ نہ تھا کہ وہ کیوں پہاڑی پر چڑھ رہا ہے...... پہاڑی زیادہ اونچی نہ تھی۔ جلد ہی وہ آخری سرے پر پہنچ گیا۔ وہ ہر روز اس پہاڑی پر چڑھنے کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ خود بخود چڑھ گیا تھا۔ اس نے دوسری طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے...... یہ گاؤں بیس پچّیس مکانات پر مشتمل تھا۔ پھر ایاز اس جانب اترنے لگا جہاں یہ گاؤں تھا نیچے اترنے کے بعد وہ چلتا ہوا ایک مکان کے پاس سے گزرنے لگا تو اسے بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ رونے کی آواز نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے تھے۔ اس نے اس گھر میں جھانکا...... ایک آدمی اور ایک عورت اپنے بچوں کے ہمراہ بیٹھے تھے بچے بین کر رہے تھے۔ عورت کی آنکھوں سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ جبکہ مرد گم صم بیٹھا زمین کو گھور رہا تھا۔

"کیا...... ہوا ہے......؟" ایاز نے ہمت کر کے پوچھا۔ عورت اور مرد نے ایک ساتھ اس کی جانب دیکھا پھر ان کے چہروں پر دوبارہ وہی حسرت و یاس چھلک پڑی انھوں نے کوئی جواب نہ دیا تو ایاز نے دوبارہ کہا۔

"مجھے بتائیں تو...... کیا ہوا ہے......؟"

"بیٹا تجھے بتا کر کیا کریں گے......!" عورت نے مایوسی سے کہا۔

"بتائیں تو......!"

"تین دن سے کھانا نہیں کھایا بیٹا...... ہم تو برداشت کرلیں گے مگر یہ بچے......"

"تو کھالیں نا کھانا......!" ایاز نے معصومیت سے کہا۔

"بیٹا کہاں سے کھالیں...... ہم تو......"

"اچھا اچھا میں سمجھ گیا" ایاز نے معصومیت سے کہا "آپ کو کھانا پکانا نہیں آتا ہوگا......!"

"نہیں بیٹا...... دراصل ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں...... کھانا کہاں سے لائیں۔"

"اچھا" ایاز سوچ میں پڑ گیا۔ "اگر میں نے اپنے عیدی کے پیسے ان کو دے دیئے تو میں وہ اڑنے والا جہاز کہاں سے خریدوں گا" پھر ایاز نے سوچا کہ اگر میں ان لوگوں کو پیسے دے بھی دوں تو بھلا یہ کیا بات ہوئی...... مگر نہیں عورت اور اس کے بچے تو رو رہے ہیں" یہ سوچ کر ایاز نے اپنے عیدی کے پیسے نکال کر اس عورت کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ پیسے دیکھ کر عورت پر خوشی کا ایک دورہ سا پڑا، اس نے ایاز کے ننھے ننھے ہاتھوں کو چوم لیا، گال تھپتھپائے، سر پر بوسہ دیا۔ آخر بڑی دیر بعد ایاز کو فراغت ملی اور وہ جلدی جلدی گھر واپس جانے لگا کیونکہ آج اس کو بہت دیر ہو گئی تھی۔

آج جمعے کا دن تھا...... دادا جان نے جمعے کی نماز ادا کی اور کاشف اور ایاز کو بلایا، ان کو پہلے ہی معلوم تھا کہ دادا جان نے کس لئے بلایا ہے لہٰذا کاشف نے اپنی تمام نیکیاں گنوانا شروع کیں پھر جب کاشف رک گیا تو دادا جان نے پیار سے اس کے کاندھے پر ہلکی سے تھپکی دی پھر دادا جان نے جب ایاز سے کہا تو وہ خاموش رہا..... دادا جان نے کریدا تو ایاز بولا "میں نے کوئی خاص نیکی کی ہی نہیں۔"

"مگر پھر بھی تم یاد تو کرو......"

"دادا جان ایک اچھا کام کیا تو تھا مگر وہ نیکی نہیں۔"

"وہ کیا......؟" دادا جان نے حیرت سے کہا۔

"وہ دادا جان ...... پہاڑی کے پیچھے گاؤں ہے نا ...... اس گاؤں میں ایک عورت اور ایک آدمی اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں ان کے چار بچے ہیں......کل جب میں اسکول سے آرہا تھا تو میں پہاڑی پار کر کے اس گاؤں میں چلا گیا...... جہاں مجھے اس عورت اور بچے کے رونے کی آواز آئی پھر میں اندر چلا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ تین دن سے بھوکے ہیں اس پر میں نے اپنی تمام عیدی کے پیسے ان لوگوں کو دے دیئے۔"

"ارے پگلے ...... یہی تو اصل نیکی ہے۔" دادا جان نے ایاز کے رکتے ہی کہا "اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض عبادت کے لئے ہی پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اس لئے بھی پیدا کیا ہے کہ اس دنیا میں محبت کا دور دورہ ہو تمام انسان ایک دوسرے کو چاہیں............ ورنہ اگر عبادت کی ہی بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ کام فرشتوں اور دیگر مخلوق سے بھی لے سکتا تھا۔"

"سچ دادا جان ...... !" ایاز خوشی سے چیخا۔

"اور نہیں تو کیا...... اور تمہاری ایک نیکی کاشف کی تمام نیکیوں کے برابر ہے...... انعام تم دونوں کو ملے گا اور ہاں کل ہم پکنک پر بھی چلیں گے۔"

"سچ دادا جان۔" وہ دونوں خوشی سے اچھل پڑے ادھر گھر کے سب افراد حیران تھے کہ وہ دونوں ایک ہفتے میں کتنا بدل چکے ہیں۔

## مجسمہ آزادی

اسرار الحق خانزادہ ٹنڈو ...

امریکہ کے شہر نیویاک میں سمندری راستے سے داخل ہونے والے ہر شخص کی نظر مجسمہ آزادی پر ضرور پڑتی ہے۔ یہ مشعل تھامے ایک عورت کا مجسمہ ہے۔ جو ساری دنیا میں آزاد رہنے والوں کے جذبات اور

احساسات کا آئینہ دار ہے۔ نیویارک میں سمندروں کے راستے سے آنے والے ہر شخص کو مجسمۂ آزادی خوش آمدید کہتا ہے۔

مجسمۂ آزادی تباہ کن طوفانی اور منہ زور لہروں کے سامنے شان بے نیازی سے کھڑا ہے اور آزادی کی شمع لئے آزادی کا پیغام دے رہا ہے۔ اس مجسمہ کو ہر سال لاکھوں افراد امریکہ میں دیکھنے جاتے ہیں۔ یہ مجسمہ ایک چھوٹے سے جزیرے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس جزیرے کو اب "جزیرہ آزادی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اس جزیرہ پر صرف کشتیوں کے ذریعے ہی پہنچا جاسکتا ہے۔

یہ مجسمہ سطح سمندر سے تین سو بیس فٹ اونچا ہے۔ یہ مجسمہ فریڈرک آگسٹی برتھولڈی نامی ایک فرانسیسی مجسمہ ساز نے تیار کیا۔

یہ مجسمہ امریکہ اور فرانس کے عوام کی دوستی اور خیر سگالی کی علامت کے طور پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس منصوبے کو پورا کرنے کے لئے امریکی، فرانسیسی انجمن دوستی کی بنیاد رکھی گئی جس نے مجسمہ کی تعمیر کے لئے سرمایہ جمع کیا۔اس مجسمہ کو فرانس میں ٹکڑوں کی صورت میں تیار کیا گیا اور ۱۸۸۵ء میں بحری جہازوں کی مدد سے اسے ۲۱۴ پیٹیوں میں بند کر کے امریکہ روانہ کر دیا گیا۔جس چبوترے پر مجسمۂ آزادی نصب ہے پھر اس چبوترے کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کیا گیا۔ اس مجسمہ کو تین سو ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے۔

۲۸ اکتوبر ۱۸۸۶ء کو صدر کلیولینڈ نے جشن آزادی کے موقع پر لاکھوں افراد کی موجودگی میں یہ یادگار مجسمہ نصب کیا۔

اس مجسمہ کا وزن ۲۵۵ ٹن اور اونچائی ۱۵۲ فٹ ہے مجسمۂ آزادی جسامت کے لحاظ سے دنیا کی عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔

مجسمۂ آزادی سالوں سے سمندر کے منہ زور طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہے اور سمندر کی تباہ کن لہروں کے سامنے ڈٹا کھڑا ہے۔ اور دنیا کے لوگوں کو آزادی کا درس دے رہا ہے۔

## معلومات عالم

مرسلہ۔ ذیشان یوسفانی

۱...... دنیا میں سب سے پہلی لڑائی حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان ہوئی۔

۲...... دنیا میں سب سے زیادہ اسکول شکاگو (امریکہ) میں ہیں۔

۳...... دنیا کی سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ ۱۹۵۳ء میں فتح ہوئی۔

۴...... دنیا کی پہلی خاتون وزیر اعظم "مسز بندرا نائیکے" تھیں۔

۵...... دنیا کی سب سے لمبی دیوار "دیوار چین" ہے۔

٦...... دنیا میں روس وہ واحد ملک ہے جس کی بارہ ممالک سے سرحدیں ملتی ہیں۔

٧...... اسلامی دنیا کا سب سے بڑا شہر "قاہرہ" ہے۔

٨...... دنیا کی سب سے بڑی گھڑی "بگ بین" لندن میں ہے۔

## سوتیلی مما

اسماء کوکب، رحیم یار خان

علی نے ڈرتے ڈرتے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا نئی امی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی گنگنا رہی تھیں، انہیں دیکھ کر علی کے سارے آئیڈیئے دھڑام سے گر کر چکنا چور ہوگئے اس کا خیال تھا کہ سوتیلی امی موٹی تازی اور کرخت لہجے والی ہوں گی۔ ماتھے پر بے شمار بل پڑے ہوں گے لیکن وہ تو انتہائی دبلی اور نازک سی تھیں۔ علی کو دیکھ کر ان کے چہرے پر شگفتہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

ادھر آئیں بیٹا انہوں نے نرمی سے پاس بلایا۔

علی ڈرتا ڈرتا ان کے پاس چلا گیا۔

آپ تو بہت اچھے ہیں انہوں نے اس کے گال چومتے ہوئے کہا میں آپ کی مما ہوں۔نہیں ............ نہیں آپ میری مما نہیں ہیں آپ سوتیلی امی ہیں۔ آپ مجھ پہ ظلم کریں گی مجھے ماریں گی۔علی نے چیخ کر کہا اور دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ علی کی امی فوت ہوگئیں تھیں امی کے مرنے کے بعد علی بہت افسردہ ہوگیا ہر وقت خاموش رہتا، اپنے کمرے میں بیٹھا کہانیاں پڑھتا رہتا ورنہ جب مما تھیں تو وہ روزانہ مما کے ساتھ کیرم کھیلتا۔ پاپا نے جب اپنے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے کو اتنا افسردہ دیکھا تو دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اور یوں سحر سوتیلی ماں کے روپ میں آگئی۔ وہ سوتیلی ماؤں سے بہت ڈرتا تھا۔اُف کتنی ظالم ہوتی ہیں سوتیلی مائیں وہ کہانیوں میں سوتیلی ماں کے ظلم پڑھتا، لیکن میں اپنی سوتیلی ماں سے نہیں ڈروں گا نہ ہی اس کا کوئی کام کروں گا اس نے سوچا۔ شام جب وہ اپنے کمرے میں بند کہانیاں پڑھنے میں مگن تھا اسکے کمرے کا دروازہ کھلا اس نے دیکھا سامنے اس کی سوتیلی مما کھڑی تھیں، شاید یہ مجھے مارنے آئی ہیں اس نے سوچا۔

علی بیٹا۔ باہر اتنا اچھا موسم ہے آپ یہاں بیٹھے ہیں آئیں باہر چل کر چائے پیتے ہیں انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو علی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ شاید ابو کی موجودگی میں اتنا پیار دکھا رہی ہیں دو پہر ان کی اصلیت کھلے گی۔

آئیں نا۔ انہوں نے اس کی کلائی پکڑنی چاہی لیکن علی نے نفرت سے جھٹک دیا "اوں............ میں نہیں آؤں گا آپ چلی جائیں اور سن لیں، اگر آپ نے مجھ سے کام کروایا پاپا کی موجودگی میں تو میں بالکل

نہیں کروں گا اور پاپا کو بھی بتادوں گا آئی ہیٹ یو آپ میری مما نہیں ہیں۔" علی نے چیختے ہوئے کہا رات وہ کھانا کھائے بغیر سوگیا۔

"علی............ علی بیٹا اٹھیں اسکول نہیں جانا"سوتیلی امی نے اسے جگایا اس نے حیرت سے انہیں دیکھا کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ اس نے سوچا سوتیلی امی اور اتنی مہربان۔ میں نے آپ کے کپڑے پریس کردیئے ہیں ناشتہ کرکے کپڑے بدل لیں اسکول وین آنے والی ہے۔ انہوں نے کہا تو علی خاموشی سے باتھ روم میں گھس گیا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوا وہ سوچ رہا تھا کہ ابو گھر میں ہیں اس لئے ڈانٹ نہیں رہیں اسکول سے آؤں گا تو پھر اصلیت کھلے گی علی جب اسکول سے آیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے بیگ پکڑا اس کو کپڑے پکڑائے۔

کیا پاپا گھر میں ہیں۔علی نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

نہیں وہ تو آفس چلے گئے آج آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ سارا دن نئی امی اسے پیار سے بلاتی رہیں اور وہ کھرے کھرے جواب دیتا رہا وہ اس کی چٹاخ پٹاخ کا جواب مسکرا کر دیتی رہیں آخر جب وہ زیادہ ہی بدتمیزی پر اتر آیا تو انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔

"علی بیٹا میں آپ کی مما ہوں مما سے کوئی ایسے بات کرتے ہیں"۔

"کوئی نہیں آپ میری مما آپ ظالم ہیں آپ سوتیلی ہیں۔ آپ مجھے ماریں گی" وہ یہ کہتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بھاگ گیا لیکن جاتے ہوئے وہ مما کی آنکھوں میں آنسو دیکھ چکا تھا۔اور یوں دن گزرتے گئے سوتیلی مما اسے بہت پیار کرتیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتیں۔ ایک دن وہ بہت بیمار ہوگیا سوتیلی امی ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہیں۔ اسے دوا دیتی رہیں وہ بہت شرمندہ تھا اور ان کہانیوں کو کوس رہا تھا جس میں سوتیلی ماں کے ظلم کے متعلق لکھا ہوتا۔ اب کیسی طبیعت ہے؟ انہوں نے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ خاموش رہا کتنا برا تھا وہ اور کتنی اچھی تھیں مما جو اسے اتنا پیار کرتیں تھیں،وہ بہت شرمندہ تھا۔

ایک بات بتائیں مما۔ اس نے آہستہ سے کہا

ہاں ............ ہاں پوچھو وہ اس کے مما کہنے پر خوشی سے نہال ہوگئیں۔

مما کہانیوں میں تو لکھا ہوتا ہے کہ سوتیلی مائیں بہت ظالم ہوتیں ہیں وہ بہت ظلم کرتی ہیں کھانے کو نہیں دیتیں مگر آپ تو بہت اچھی ہیں آپ یہ سب کچھ کیوں نہیں کرتیں۔

اس کا سوال سن کر وہ مسکرادیں۔ دیکھو نا علی بیٹا سب ایک سے تو نہیں ہوتے نا۔ اور جو یہ سب کچھ کرتیں ہیں وہ ناسمجھ ہوتی ہیں بچے تو بہت معصوم ہوتے ہیں بھولے بھالے ان پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہئے پانچوں انگلیاں ایک سی تو نہیں ہوتیں اور مما کی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ مجھے معاف کردیں مما۔ میں بہت برا ہوں علی نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ اور مما نے مسکراتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

## کرکٹ کے رنگ

انور حسین پشاور

۱............ ایک ٹیسٹ میں جم لیکر نے انیس (۱۹) وکٹیں حاصل کی تھیں اس ٹیسٹ میں بیسواں کھلاڑی رن آؤٹ ہوا تھا۔

۲............ ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے کم ریکارڈ نیوزی لینڈ کا ہے۔ اس نے انگلینڈ کے خلاف صرف ۲۶ رنز بنائے تھے۔

۳.......... بریڈمین دنیا کے وہ واحد کھلاڑی ہیں جنہوں نے فرسٹ کلاس کرکٹ میچ میں ۳ اوورز میں سنچری بنائی تھی۔

۴.......... ٹیسٹ کرکٹ میں آسٹریلیا کے کھلاڑی نے سب سے پہلے ڈبل سنچری بنائی اس کا نام ایس ای گریگوری تھا۔

۵.......... جم لیکر دنیا کا وہ واحد کھلاڑی ہے۔ جس نے ایک ٹیسٹ میچ کی ایک اننگز میں دس کی دس وکٹیں حاصل کیں۔

## خطرناک غلطیاں

اسد علی خان، حیدرآباد

۱..... اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقل مند اور لائق آدمی تصور کرنا۔

۲..... ہر ایک سے بدی کرنا اور خود آرام میں رہنے کی توقع رکھنا۔

۳..... اس نیت سے عیب کرنا کہ صرف دو چار مرتبہ کر کے چھوڑوں گا۔

۴..... ہر شخص کے متعلق ظاہری صورت دیکھ کر رائے قائم کرلینا۔

۵..... بے کاری میں آئندہ کے لئے خیالی پلاؤ پکانا اور خوش ہونا۔

## ایٹم بم

فیضان عثمانی کراچی

۱۶ اگست ۱۹۴۵ء کا دن دنیا میں تباہی کا بد ترین دن ثابت ہوا جب امریکہ نے جاپان کے شہر "ہیروشیما" پر ایٹم بم گرایا۔ صبح کے ٹھیک ساڑھے

آٹھ بجے ایک امریکی طیارہ "بی ۲۹" جاپان کے شہر ہیروشیما پر سے گزرا۔ اس طیارے کو دیکھتے ہی جاپانی لوگ تیار ہوگئے اور خطرے کا سائرن بجنے لگا۔

یہ امریکی طیارہ یہ دیکھنے آیا تھا کہ ہیروشیما کا موسم کیسا ہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور اس سے لگتا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ اب امریکی طیارہ "بی ۲۹" کا پائلٹ ہوشیار ہوگیا تھا کیونکہ اب جو اس کو ہیروشیما پر سے گزرنا تھا اس کے اوپر ایٹم بم پھینکنا تھا اور فوراً ہی آسمان پر سے جہاز کو غائب کرنا تھا۔

اس امریکی طیارے "بی ۲۹" کو "اینولاگے" بھی کہا جاتا ہے اس کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ صرف ۱۷ اسکنڈ میں اپنے نشانے کے قریب پہنچ گیا۔ ۴۷۰۰ فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے دو مزید طیارے اس کے ساتھ موجود تھے ایک جہاز کا مقصد تباہی کی تصویر اتارنا تھا اور دوسرے جہاز کو تباہی کے بارے میں فنی معلومات جمع کرنی تھیں۔ اس جہاز میں "لیری جانسٹن" بھی سوار تھا جو کہ ایٹم بم تیار کرنے کی جماعت کا سربراہ تھا۔

ہیروشیما اب صرف دس منٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ راستے میں انہیں کسی جاپانی لڑاکا طیارے کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ جہاز کے عملے نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کچھ دکھائی نہ دیا سوائے چھ جزیروں پر مشتمل ہیروشیما کے۔

جہاز کے عملے نے پہلے سے اتاری گئی تصویر میں اپنا ہدف تلاش کرنے کی کوشش کی "اوکے میں نے پل دیکھ لیا ہے" فیری بی ن آگے جھکتے ہوئے کہا۔

یہ پل ان ۸۱ پلوں میں سے ایک تھا جو جزیروں کو ایک دوسرے سے ملاتے تھے اور یہی ان کا نشانہ تھا۔ عملے کے تمام لوگوں نے اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمے چڑھالئے عین آٹھ بج کر ستائیس منٹ کو جہاز کا نچلا حصہ کھل گیا اور ایٹم بم ہیروشیما کی طرف بڑھنے لگا۔

اور اس کے چند سیکنڈ بعد ایٹم بم ہیروشیما پر گرا اور اسی وقت آسمان کی طرف رخ کرنے والے سیاہ بادل نمودار ہونے لگے۔

جہاں ایٹم بم گرا تھا وہاں اس کے تین منٹ بعد وہاں کا درجہ حرارت ۴۰۰ فارن ہو گیا اتنا زیادہ درجۂ حرارت تو لوہے کو پگھلانے سے بھی دوگنا زیادہ تھا۔ اور اسی وقت ۶۵ ہزار افراد لقمہ اجل بن گئے۔ لیکن اس کے بعد بھی ہلاکت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس بم کی تباہی سے جو لوگ زندہ بچے وہ زندگی بھر معذور رہے۔ جس جگہ پر ایٹم بم گرایا گیا تھا وہاں اب ایک پارک بنا ہوا ہے جس کا نام "امن پارک" ہے۔ اس پارک میں ایک مینار ہے جس کے اوپر ایک مجسمہ بنا ہوا ہے یہ مجسمہ ایک بچے کا ہے جو کہ اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے ہوئے ہے اس مجسّے کو جاپانی قوم امن کا یادگاری نشان سمجھتی ہے۔

## دلچسپ پہیلیاں

مرسلہ: حافظ محمد معاویہ

(۱) ایک ہے ایسا کاری گر
دیکھا اسکا خوب ہنر
پتلے وہ دن رات بنائے
ایک سے ایک نہ ملنے پائے

(۲) ایک سمندر تیس جزیرے
بکھرے ان میں موتی ہیرے
جو بھی ان کی سیر کو جائے
مفت میں ہیرے موتی پائے

(۳) سورج کے جانے پر تین
سورج کے آنے پر دو
صدیوں سے ہوتا آیا
اور قیامت تک یہ ہو

(۴) جنت میں جانے کا حیلہ
دنیا میں وہ ایک وسیلہ
جس کو جنت کی خواہش ہو
مت بھولے اس کے قدموں کو

(۵) پھولوں میں دو پھول نرالے
پاتے ان کو قسمت والے
کوئی ایک یا دونوں پائے
خالی ہاتھ نہ کوئی رہ جائے
(۶) بنے ہوئے ہیں ایسے دو گھر
دیکھ سکیں نہ جن کو جا کر
ایک میں ہم کو جانا ہوگا
اور پھر وہیں ٹھکانا ہوگا
(۷) سو گھوڑے اور ایک لگام
آگے پیچھے چلیں تمام
(۸) چھوڑو مت تم اس کا ساتھ
لے لو اس کو ہاتھوں ہاتھ
چپکے چپکے عرش پہ جائے
تحفے لے کر فرش پہ آئے
(۹) جس کے پاؤں کے نیچے آئے
کانوں کو وہ ہاتھ لگائے
(۱۰) اس کے ہوتے کچھ نہ کھایا
کھایا جب نہ اس کو پایا

## نئے عجیب بات

مرسلہ: خالد مغل کراچی

○ ........... فرانس میں ایک اخبار عرصے تک ربڑ پر چھپتا رہا۔

○ ........... سانپوں کی ایک (Rain Bow Sn-ake) کا انڈا خود بخود بڑھتا رہتا ہے۔

○ ........... مشہور امریکی سیاہ کرسٹوفر کولمبس کو مرنے کے بعد آٹھ بار دفن کیا گیا۔

○ ........... بندر کے دو دماغ ہوتے ہیں۔ ایک پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے اور ایک دم کو کنٹرول کرتا ہے۔

○ ........... نائیجیریا (افریقہ) میں (توارج) نامی قبیلے کے مرد نقاب پہنتے ہیں۔

## محمود و ایاز

نامعلوم

سیٹھ باقر علی شہر کا بڑا سیٹھ تھا مگر بہت مغرور اور خود سر تھا۔ غریب کو بہت حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا سیٹھ کا نوکر فضلو بابا تھا۔ باقر ہر وقت اسے جھڑکیاں دیتا رہتا تھا اور اسے بڑا ہی حقیر جانتا تھا۔ ان تمام برائیوں کے باوجود اس میں ایک اچھائی نماز پڑھنے کی تھی۔ ایک رات پانی لاتے وقت فضلو بابا سے گلاس ٹوٹ گیا۔ سیٹھ غصے سے بولا "اتنا قیمتی گلاس توڑ دیا جس کی قیمت تم سے بھی زیادہ ہوگی۔" پھر کچھ دیر بعد دونوں عشاء کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ نماز پڑھنے کے بعد واپس آتے ہوئے فضلو بابا بولا "جناب ایک بات عرض کروں" سیٹھ بولا "ہاں کرو، حقیر آدمی کی بات بھی حقیر ہی ہوگی۔" فضلو بابا بولا "سیٹھ صاحب خدا کے سامنے سب انسان برابر ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ مسجد میں ہر بڑا چھوٹا گورا کالا ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر خدا کے سامنے جھکتے ہیں۔" یہ سن کر سیٹھ ہکا بکا رہ گیا اور بولا "بابا تم نے تو میری آنکھیں کھول دیں ہیں تم نے ایک بڑی بات بتائی ہے تم ایک بڑے

آدمی ہو آئندہ میں کسی کو حقیر نہ جانوں گا۔"

## عجیب رسم

مرسلہ...... سید سلیمان حیدر، کراچی

## پورا کیک کھایئے ورنہ......

تبت کے شوکا قبائل میں شادی کی ادائیگی کے لئے دولہا لہن کو پورا ایک کیک کھانا پڑتا ہے اور یہ ضروری ہوتا ہے کہ یہ سارا کیک ختم کرلیا جائے اگر دولہا اور دلہن میں کوئی بھی کیک کھانے میں ناکام رہے تو وہ شادی اسی وقت ختم ہوجاتی ہے۔

## نصیحت

محمد سعید سومرو، قمبر لاڑکانہ

زندگی میں پیش آتے ہیں ہزاروں امتحاں
حوصلے سے کام لینا سیکھ لے اے نوجوان
ہر قدم پر رونما ہوں گی کئی دشواریاں
یہ مناسب ہے ابھی سے تم کرو تیاریاں
ہر مصیبت کا سبب بنتی ہے انسان کی زباں
اپنے منہ سے مت کہو یہ ہیں ہماری خوبیاں
لوگ خود معلوم کر لیں گے تمہاری خوبیاں
بھول کر دیتی نہیں گالی شریفوں کی زباں
یہ کمینوں کی علامت ہے رزیلوں کا نشان
وقت آئے تو فدا کر دو وطن پر مال و جاں
جس کی پیداوار کھا پی کر ہوئے ہو تم جواں

## شاعر عبداللطیف بھٹائی

اسلام الدین راجپوت شکارپور

آؤ کریں ہم مل کر بھائی
صوفی صافی اللہ والے
سندھ ہے جن کے نام سے روشن
انسانوں سے پیار تھا جن کو
نا سمجھوں کو سمجھاتے تھے
شاہ کا رسالہ درس محبت
ذکر شاہ لطیف بھٹائی
پیت کی بنسی جگ میں بجائی
سندھ نے ان سے عظمت پائی
دل میں کب نفرت تھی بھائی
سب کو سیدھی راہ دکھائی
میٹھا جیسے دودھ ملائی

## ایک کرنسی

مرسلہ:۔ ساجد محمد روشن، اٹک۔

| ملک | سکے کا نام |
|---|---|
| ۱۔ پاکستان | روپیہ |
| ۲۔ سری لنکا | روپیہ |
| ۳۔ انڈونیشیا | روپیہ |
| ۴۔ سیچلز | روپیہ |
| ۵۔ ماریشس | روپیہ |
| ۶۔ نیپال | روپیہ |
| ۷۔ بھارت | روپیہ |

## ہم نام دارالحکومت

| ملک کا نام | دارالحکومت | براعظم |
|---|---|---|
| ۱۔ الجزائر | الجزائر | افریقہ |

| | | |
|---|---|---|
| ۲۔ پانامہ | پانامہ | شمالی امریکہ |
| ۳۔ تیونس | تیونس | افریقہ |
| ۴۔ جبوتی | جبوتی | افریقہ |
| ۵۔ سان مارینور | سان مارینور | یورپ |
| ۶۔ سنگاپور | سنگاپور | ایشیا |
| ۷۔ کویت | کویت | ایشیا |
| ۸لکسمبرگ | لکسمبرگ | ایشیا |
| ۹۔ میکاؤ | میکاؤ | ایشیا |
| ۱۰۔ مناکو | مناکو | یورپ |
| ۱۱۔ ویٹی کن | ویٹی کن | یورپ |
| ۱۲۔ ہانگ کانگ | ہانگ کانگ | ایشیا |

## کیا آپ کو معلوم ہے ؟

مرسلہ ، صائمہ انصاری ...... حیدر آباد

۱) پہلا خلائی جہاز دنیا کے گرد ۱۹۵۷ء میں چھوڑا گیا۔

۲) ماہرین کے کہنے کے مطابق ۶ جولائی ۲۱۶۸ء میں مکمل سورج گرہن ہو گا۔

۳) رکشہ جاپان کی ایجاد ہے۔

۴) ٹیلیفون میں ۶۰ وولٹ بجلی ہوتی ہے۔

۵) حبشہ کا موجودہ نام ایتھوپیا ہے۔

۶) سب سے پہلے چائنا نے آتش بازی کو باقاعدہ فن کے ذریعے پیش کیا۔

۷) یورپ کی پہلی مسجد، مسجد قرطبہ ہے جو اسپین میں واقع ہے۔

۸) دنیا کا سب سے پرانا ترانہ جاپان کا ہے جس کا نام گیمی گایو ہے۔

۹) آکسیجن گیس جوزف پرسٹلے نے دریافت کی تھی۔

۱۰) ملکہ وکٹوریہ کے اردو کے استاد کا نام منشی کریم الدین تھا۔

## جوابات

(۱) اللہ
(۲) قرآن مجید
(۳) پانچ نمازیں
(۴) ماں
(۵) بیٹا بیٹی
(۶) جنت اور دوزخ
(۷) تسبیح
(۸) دعا
(۹) جانماز
(۱۰) روزہ

### معذرت

آنکھ مچولی شمارہ اگست ۹۱ء کے سلسلے "کمسن قلم کار" میں شائع ہونے والی تحریر "دوستی" پر سہواً ضرغام راجہ کا نام شائع ہو گیا تھا جبکہ یہ تحریر فیصل آباد کے محمد رمضان رحمانی کی تھی۔ ادارہ اس غلطی پر معذرت خواہ ہے۔

(ادارہ)

# آدابِ سفر

سفر وسیلہ ظفر ہے

اسے زحمت نہ بنائیے

سفر سے پہلے اپنے لیے سیٹ یا برتھ
ریزور کروائیں اور اطمینان سے سفر کریں
یہ سہولت بیشتر گاڑیوں میں موجود ہے۔

**براہ کرم پاکستان ریلوے سے تعاون کیجئے**

محکمہ تعلقات عامہ

# روشن مثال

نام: جتیندر رنند کشور ۱۳ سال آٹھویں
مشاغل: ٹکٹ جمع کرنا مضمون: سائنس
کامیابی: چوتھی، پانچویں اور ساتویں میں پہلی پوزیشن
پتہ: ایف-۱۲۳۶ گاڑی کھاتہ حیدرآباد

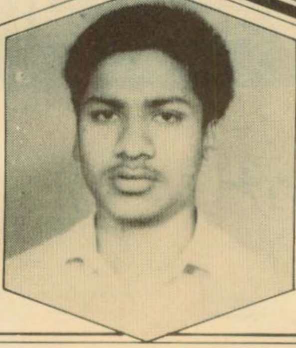

نام: محمد ندیم طارق جگنو ۱۶ سال گیارہویں
مشاغل: کرکٹ کھیلنا قلمی دوستی مضمون: انگریزی
اہم کامیابی: میٹرک میں اے گریڈ
پتہ: حویلی مولویاں ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ

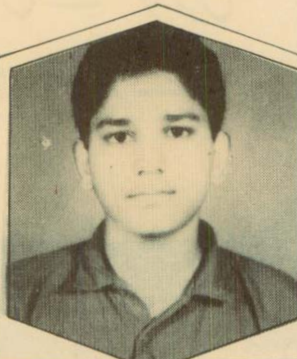

نام: جواد خان ۱۵ سال گیارہویں
مشاغل: کرکٹ، شطرنج مضمون: بیالوجی
اہم کامیابی: دسویں میں اے گریڈ
محمد اسلم خان ۲۰ نورالحق کالونی نزد ایس ای کالج بھاولپور

نام: محمد آصف خان ۱۸ سال ایف اے
مشاغل: مطالعۂ کتب قلمی دوستی مضمون: عربی، انگریزی
اہم کامیابی: باکسنگ میں متعدد انعامات
محمد آصف رحمان پی او بکس ۱۵۸ جی پی او ساہیوال

نیا پیاسا نیا نیا خاص نمبر

# آنکھ مچولی کا آئندہ خصوصی شمارہ

# عالمی ادب نمبر

جنوری ۱۹۹۲ء میں شائع ہو رہا ہے

- دیس دیس کی کہانیاں۔
- نگر نگر کے قصّے۔
- دُنیا بھر کے ادب سے بہترین انتخاب۔

آپ بھی لکھئے اور اپنے حسنِ انتخاب کی داد پائیے

- ہر قابلِ اشاعت تحریر پر ۱۰۰ روپے سے ۵۰۰ روپے تک کا معاوضہ۔
- ہر وہ تحریر زیادہ معاوضے کے قابل سمجھی جائے گی جس کا تعلق غیر معروف دُنیائے اَدب سے ہو۔
- ہر ترجمے کے لیے اصل تحریر کا حوالہ ضروری ہوگا۔

# امّی ابّو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

رمیصاء سلیم

"ہم اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنائیں گے۔ خود ہر طرح کی تکلیف سہہ لیں گے مگر انہیں کسی طرح کی تکلیف نہیں پہنچنے دیں گے۔ زندگی میں کچھ ہم حاصل نہیں کر سکے، انہیں اپنے بچوں کے ذریعہ پورا ہوتے دیکھیں گے ........... وغیرہ وغیرہ۔"

اپنی اولاد کی بہتری کے لئے ایسے جذبات رکھنا فطری عمل ہے۔ والدین معاشی اور معاشرتی حوالوں سے کسی بھی حیثیت کے حامل ہوں گے مگر اپنی اولاد کے لئے ایسے جذبات ضرور رکھتے ہوں گے۔ یہ جذبہ اللہ تعالیٰ انسان کے اندر ودیعت نہ کرتا تو سوچئے بچوں کی پرورش اور نسلوں کی بقا کتنا مشکل کام ہو جاتا۔

جب یہ جذبہ فطری ہے اور تمام والدین اپنی اولاد کے لئے ایسے ہی جذبات رکھتے ہیں تو پھر آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کچھ اولادیں تو والدین کے خوابوں کی تعمیر بن کر بامراد اور کامیاب ہوتی ہیں اور کچھ ناکام و نامراد؟

اس سوال کا جواب بحث کی نئی راہیں کھولتا ہے۔ اس میں قسمت اور تقدیر کی باتیں، حالات اور حوادث کا ذکر اور جہل و خرد کی بہت سی باتیں شروع ہو جاتیں ہیں۔ ہمیں اس بحث سے کوئی سروکار نہیں ہم تو بس آپ سے اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ گھر رہنے کی جگہ کے علاوہ ایک تربیتی ادارہ بھی ہے۔

آپ اپنے تئیں غور کیجئے کہ بچوں کے اس تربیتی ادارے میں سرمائے کے علاوہ آپ کی سوچ، فکر، منصوبہ بندی، وقت اور آپ کی صلاحیتوں کا Investmint بھی ہے یا نہیں؟

جو والدین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بچوں پر بہت خرچ کرتے ہیں اور ایسا کرنے سے مطلوبہ نتائج حاصل کرلیں گے وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔

اس بات کو مت بھولئے کہ اپنے بچوں کے لئے اپنے سرمائے کے علاوہ اپنی ذات کو بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔

جو والدین اپنی جملہ صلاحیتوں کے ساتھ، اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لئے ہمہ تن مصروف ہیں وہی بامراد ہیں۔ اور جنہیں کاروباری مصروفیات یا دیگر مشاغل نے گھر کے نظام سے کاٹ کر رکھ دیا ہے، انہیں ابھی سے فکر کرنی چاہئے۔

دنیا بھر میں آزمودہ
نیا
FRESHMINT
FLUORIDE
macleans
UNIQUE FORMULA for healthy teeth AND GUMS
پلاک دور
PLAQUE FIGHTING
PA1
سے پلاک دور!
پلاک کیا ہے ؟
پلاک جراثیم کی چکنی تہہ ہے جو
دانتوں کی سطح پر جم جاتی ہے۔ اگر
اس کو دور نہ کریں تو اس کی وجہ سے دانتوں کو
کیڑا لگتا ہے۔ پلاک مسوڑوں کی بیماری کا
سبب ہے جس سے دانت گرتے ہیں۔
نیا میکلینس - پلاک سے حفاظت
کے لئے دنیا بھر میں آزمودہ۔
میکلینس نے مسوڑوں کی صحت کے لئے
اپنے فلورائیڈ ٹوتھ پیسٹ کے نئے منفرد
فارمولے میں PA1 کا اضافہ کیا ہے۔ یہ
خصوصی جراثیم کش جزو کلینیکل تجربات میں
پلاک سے بچاؤ کے لئے آزمایا ہوا ہے، اور فلورائیڈ
کیڑے سے حفاظت کے لئے مؤثر ہے۔
MILDMINT
macleans
FRESHMINT
macleans
FIGHTS DECAY • FIGHTS PLAQUE
پلاک دور۔
دانت مضبوط

ASIATI

MONTHLY AANKH MACHOLEE KARACHI
OCTOBER 1991

ORIENT